اقبال

جہانِ نو کی تلاش میں

ڈاکٹر یوسف اعظمی

اقبال ـــــــ

جہانِ نو کی تلاش میں

ڈاکٹر یوسف اعظمی

اقبال اکیڈمی، حیدرآباد

اقبال۔ جہانِ نو کی تلاش میں

(اقبالیات پر مضامین)

ڈاکٹر یوسف اعظمی

سن اشاعت	:	2005
قیمت	:	Rs: 150
لائبریری ایڈیشن	:	Rs.200
مشرقِ وسطیٰ	:	Riyals 20
امریکہ	:	10$ U.S.
تعداد اشاعت	:	600

ناشر : اقبال اکیڈیمی ' حیدرآباد

کمپیوٹر کتابت وطباعت :

ریاض پرنٹرس' حیدرآباد

Iqbal - Jahan -e- Nao Ki Talash Mein

Dr. Yusuf Azmi

Distributors - تقسیم کار

- اقبال اکیڈیمی' گلشن خلیل' حیدرآباد — *Iqbal Academi, Masab Tank, Hyd.*
- اردو بک ڈپو' انجمن ترقی اردو' حیدرآباد — *Urdu Book Depot, Urdu Hall, Hyd.*
- سب رس کتاب گھر' ایوانِ اردو' حیدرآباد — *Aiwan-e-Urdu, Punjagutta, Hyd.*
- مکتبہ جامعہ' نئی دہلی — *Maktaba-e-Jamia, New Delhi,*
- انڈیا بک ہاؤس' دیوان' شکاگو — *India Book House, Chicago. (U.S.)*

ISBN.81-86370-26-9

Author : 13-6-437/1/B/13, Paramount Classic, Khader Bagh,

Hyderabad-500008.(A.P.)

Yusuf_Azmi@yahoo.com

Tel : 55155496, 24560543 (R) 9246267646 (M)

یہ کتاب اردو اکیڈیمی آندھراپردیش کی جزوی مالی اعانت سے شائع کی گئی ہے۔

انتساب

- برِ صغیر میں ....

عاشقانِ اقبال کی نذر

- امریکہ، یوروپ، مشرق وسطی اور جنوبی آفریقہ کی ....

اردو بستیوں کے نام

- ایران اور وسط ایشیاء میں ....

انقلابی فکر سے سرشار لوگوں کے لیے سوغات

- دنیا کے نوجوانوں کے نام ....

جو فکرِ اقبال سے نئی توانائی حاصل کر سکتے ہیں

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ کون غزل خواں ہے پُرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

ترتیبِ مضامین

- مطالعہ اقبال ۔۔ پس منظر اور پیش منظر ۔
- اقبال کی شاعری کے ادبی اور فکری سرچشمے ۔
- اقبال کی غزل میں روایت اور انحراف ۔
- بیسویں صدی کے تاریخ ساز معاصرین ۔۔ اقبال اور ایلیٹ
- اقبال کا تصورِ انسان ۔
- مذہبی فکر ۔۔ خطبات کے آئینے میں ۔
- نوجوانوں کا رول اقبال کی نظر میں ۔
- فلسفہِ حیات ۔۔ شاعری کے حوالے سے ۔
- اکیسویں صدی میں شاعرِ مشرق کی معنویت ۔

مطالعہ اقبال۔ پس منظر اور پیش منظر

ترکی کے مشہور دانشور شکیب ارسلان کے خیال میں اقبال کئی صدیوں پر محیط مسلم تہذیب کا نچوڑ (Essence) ہیں۔ یہ مبالغہ آرائی نہیں بلکہ ایک خوشگوار حقیقت ہے۔

وہ پتھروں کے شہر کو نظر کا خواب دے گیا
وہ ذہن و دل کو فکر کی نئی کتاب دے گیا

وہ حرفِ حق کا آئینہ نفس کی آگ بن گیا
زمیں زمیں افق افق وہ ایک راگ بن گیا

وہ حرف حرف آگہی، وہ لفظ لفظ روشنی
وہ جستجو کی راہ میں سفر کا اک حسیں نشاں

حسین صبح ہے ہمارے خون میں رواں دواں
ہمارے زخم کی سحر، ہمارے درد کی اذاں

میں نے قارئین کے لئے اپنے شعری مجموعہ شہرِ صبا کی ایک نظم

''آسماں کا سفیر'' (نذرِ اقبال) سے چند شعر یہاں پیش کیے ہیں۔ ان شعروں میں جہانِ نو کی تلاش میں سرگرمِ عمل عظیم شخصیت اور نظر کا خواب دینے والے فکری رہنما' شاعرِ مشرق کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ برِصغیر کے عوام نے اقبال کو بے پناہ محبت دی۔ ایران اور دوسرے ممالک میں بھی ان کی پذیرائی ہوئی۔ مشرقِ وسطیٰ اور مغربی دنیا میں اردو کی نئی بستیوں کو اپنے مخصوص حالات کی روشنی میں اقبال کی گہری معنویت کا احساس ہوا۔ شاعرِ مشرق اپنی زندگی ہی میں (Legend) بن گئے تھے۔ مجموعی حیثیت سے آج بھی ان کی معنویت برقرار ہے۔

علامہ اقبال کا مطالعہ برصغیر اور دوسرے علاقوں میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔ اردو کے کسی شاعر اور فلسفی پر ایسا تفصیلی کام نہیں ہوا جو اقبال کے حصے میں آیا۔ سچ تو یہ ہے کہ عالمی ادب میں بھی چند ہی ایسی ہستیاں ہیں جن کی شخصیت اور شاعری پر اتنی تفصیل سے ہمہ جہتی کام ہوا ہے۔ لیکن اس تلخ حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالعہ اقبال کا ایک حصہ جذباتی 'غیر معروضی اندازِ فکر سے عبارت ہے۔ دراصل اقبال کی عبقری شخصیت کے علاوہ برصغیر کے سیاسی اور سماجی حالات بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔

اقبال کی شاعری میں کئی صدیوں اور بے شمار آوازوں کی گونج ہے۔ ایک سمفنی کی طرح کئی Musical notes ایک خوبصورت امتزاج میں ڈھل گئے ہیں۔ سات سُروں کی کہکشاں میں اس تخلیقی عمل کے ذریعہ ایک ان دیکھا آٹھواں سُر بھی شامل رہتا

ہے جس سے ان کی شناخت اور پہچان میں مدد ملتی ہے۔ یہ تخلیقی عمل اور خوبصورت امتزاج انفرادیت کو متعین کرتا ہے۔ کلامِ اقبال میں مذہبی سرچشمے ہیں' تہذیب وتمدن کی رعنائیاں ہیں' قوموں کا عروج وزوال ہے' تاریخ کے دھارے ہیں' عصرِ حاضر کی تحریکیں ہیں' سماجی حقائق' انسانی جدوجہد کی داستانیں' اور ان کے ساتھ فکر ودانش کی شمعیں فروزاں ہیں جن کی کرنیں مشرق ومغرب سے پھوٹتی ہیں۔ سائنس کے تجربات ہیں' فلسفوں کی کشاکش ہے' کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے' تازہ بستیوں کے امکانات ہیں' اساطیری رجحانات ہیں' Being اور Becoming کا عمل ہے۔ اس طرح ستاروں کی کہکشاں کے درمیان مستقل کشش کا عمل ہے۔

نئے ادبی رجحانات اور تھیوری Theory کی روشنی میں ان کے کلام کی منفرد خصوصیات سامنے آتی ہیں۔ ساختیات' پس ساختیات' اور ردِ تشکیل Deconstruction کی روشنی میں بھی شعر کی نئی تفہیم حاصل ہوتی ہے۔ اردو شاعری کے سفر پر کئی تحریکوں کا اثر رہا ہے۔ پرانے ادوار کی کلاسیکیت اور رومانی قدروں سے قطع نظر ترقی پسندی' جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی پرچھائیاں بھی ملتی ہیں۔

یہاں میں اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ ابتدا میں مجھے مولانا آزاد کی تحریروں اور خاص طور سے **الہلال** کی تحریروں سے غیر معمولی عشق ہوگیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اقبال کی شعری تخلیقات سے شناسائی ہوئی۔ لیکن اقبال کی شاعری آہستہ آہستہ جذبہ وذہن

کو متاثر کرتی رہی ۔ میرے استاد مصلح الدین فاروقی نے ان دونوں عبقری شخصیتوں کی عظمت کا احساس دلایا تھا۔ حیدرآباد میں اقبال اکیڈیمی کے قیام اوراس کی سرگرمیوں سے شاعرِ مشرق کے نئے نئے گوشے اور فکر کے دریچے کھلنے لگے ۔ اکیڈیمی سے وابستگی' بزرگوں اوراحباب کے حلقوں نے اقبال اسٹڈیز سے رابطہ کو استحکام بخشا ۔

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی تک انگریزی ادب کے مطالعہ میں شب وروز کی سرگرمیاں تھیں لیکن پیکریت(Imagism) کی تحریک پر ایم فل کے تحقیقی کام کے بعد پی ایچ ڈی کے لئے کام کرنے کا حوصلہ ملا تو حیدرآباد میں ASRC کی موجودگی اور میرے استاد پروفیسر ایزک سیکویرا کی تجویز کی روشنی میں Projective Movement پر ابتدائی ریسرچ کی شروعات ہوئی ۔لیکن اس موضوع سے اطمینان نہیں ہوا۔اس دوران کشمیر یونیورسٹی میں ہندوستان میں تصوف سے متعلق ایک سمینار میں شرکت کا موقع ملا ۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کے دوران ایلیٹ اور اقبال پر تحقیقی کام کرنے کا شعور جاگا ۔اسی موضوع پر میں نے انگریزی میں ڈاکٹریٹ کی تکمیل کی ۔ مشرق اور مغرب سے تعلق رکھنے والے بیسویں صدی کے دو literary giants پر تحقیقی کام اوران کا تقابلی مطالعہ آسان نہ تھا ۔ پانچ سال کے طویل عرصہ میں اس کام کی تکمیل ہوئی ۔ شعبہ انگریزی انوارالعلوم کالج اور عثمانیہ یونیورسٹی میں تدریسی خدمات اور تحقیقی کام ایک ساتھ چلتے رہے ۔لیکن اس پانچ سالہ منصوبہ میں اقبال اور ایلیٹ کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے مواقع ملے ۔

ڈاکٹریٹ کی تکمیل کے دوسال بعد 1991 میں چارلس ویلس ٹرسٹ کے انٹرنیشنل ایکسچینج پروگرام اور برٹش کونسل کے تعاون سے پہلی بار ہندوستان سے باہر برطانیہ جانے کی سعادت حصہ میں آئی۔ یہہ پروگرام دراصل ایلیٹ پراڈوانس ریسرچ کے سلسلے میں تھا۔ تاہم اردو حلقوں کی محبت کی وجہ سے برطانیہ کے مختلف شہروں اور یونیورسٹی کالجس اور اداروں میں اقبال پر توسیعی لکچرس دینے کی دعوت وصول ہوئی۔ کیمبرج، آکسفورڈ اور لندن کی یونیورسٹیوں میں مختصر مدت میں ریسرچ کی جزوی تکمیل کے بعد میرے دامن میں جو وقت رہ گیا وہ اقبال پر توسیعی تقاریر میں بیت گیا۔ برطانیہ کے تہذیبی مراکز میں اقبال کے چاہنے والوں کا وسیع حلقہ سامنے آیا۔ یوں تو حیدرآباد میں اقبال انٹرنیشنل سمینار کے کوآرڈینیٹر کی حیثیت سے پاکستان برطانیہ مصر اور دیگر ممالک کے ماہرین اقبالیات سے ملنے کی سعادتیں حصے میں آئیں۔ مگر اس سفر میں لندن اور برطانیہ کے دوسرے شہروں کے وسیع تر حلقوں اور بین الاقوامی سطح پر اقبال کی پذیرائی سے آگہی ہوئی۔ بعض لکچرس میں اردو سے ناواقف مقتدر شخصیتوں اور ارکان پارلیمنٹ کی شرکت سے دل کو نیا حوصلہ ملا اور اس احساس کو تقویت ملی کہ اقبال عالم انسانیت کی میراث ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ برطانیہ انگریزی کا دارالخلافہ ہی نہیں بلکہ اردو کی نئی بستیوں میں بھی ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

برطانیہ کے بعد شمالی امریکہ جانے کی سعادت حصے میں آئی تو پتہ چلا کہ تضادات سے بھری دنیا کی سب سے طاقتور جمہوریت میں برصغیر کے عوام نے شمع اقبال فروزاں رکھی ہے۔ اس علاقے میں بھی اقبال کی چاہت غیر معمولی ہے۔ یہ چاہت،

سیاسی وجوہات کی وجہ سے کم اور فکرِ اقبال کی تفہیم سے زیادہ مربوط تھی۔ برصغیر کے عوام نے چاہے وہ اپنی سرزمین پر رہیں' یا تارکین وطن کی صف میں اپنی شناخت تلاش کریں؛ نئی دنیا کی بھاگ دوڑ میں اپنا مقام متعین کرنے کی فکر میں ڈوبے رہیں یا تہذیبوں کے تصادم کے پس منظر میں زندگی کا نیا قرینہ حاصل کریں' اقبال کو اپنے دل کی دھڑکنوں اور سوچ کی لہروں میں محفوظ رکھا۔ امریکہ کے مختلف شہروں میں کئی بین الاقوامی اجتماعات' اداروں اور جامعات' کالجس میں اقبال کے تصورات کو پیش کرنے کے مواقع حاصل رہے۔ خاص طور سے اقبال سوسائٹی' شکاگو میں اقبال اور مغربی مفکرین Iqbal and Western Thought پر مضامین پیش کرنے کا سلسلہ رہا۔ شکاگو میں قیام کے دوران' ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی میں اڈجنکٹ پروفیسر Adjunct Professor کی حیثیت سے اسلامیات اور خاص طور سے اسلامی فکر Islamic Thought کو کئی سال پڑھانے کی وجہ سے فکرِ اقبال کی مزید تفہیم ہوئی۔ دنیا کے مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے طلبا اور اساتذہ سے گفتگو کے سلسلے دراز رہے۔

مغربی دنیا میں اقبال کی غیر معمولی چاہت کے تجربوں سے دوچار ہوئے ہی نہ تھے کہ جنوبی افریقہ میں پارلیمنٹ آف ورلڈ ریلیجنس (Parliment of World Religions) میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ کیپ ٹاؤن کی سرزمین پر ایک ادارہ بزمِ اردو بھی فعال ہے۔ نئی سرزمین پر اردو اور اپنی ثقافت سے ربط نہ ٹوٹنے کے لئے ایک نئی ڈور باندھ

رکھی ہے۔ یہی وہ دھرتی ہے جہاں بیسویں صدی کی عظیم شخصیت موہن داس کرم چند گاندھی نے ٹالسٹائے فارم پر طلبا کو اردو پڑھانے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ بزمِ اردو کی خواہش پر اور اس کے تعاون سے کیپ ٹاؤن کی یونیورسٹی میں انگریزی میں اقبال کے تصور انسان پر مقالہ پیش کرنے کی سعادت ملی۔

مطالعہ اقبال کا جہاں تک تعلق ہے پاکستان میں عوام اور سرکاری سطحوں پر پیش رفت ہوئی مگر ہندوستان کی دھرتی نے تیز و تند ہواؤں کی زد میں بھی شمع اقبال جلائے رکھی اور جب دھند لکے چھٹ گئے تو اقبال کے ساتھ اپنائیت ہمارے قومی شعور کا حصہ بن گئی۔

ہندوستان میں مطالعہ اقبال کے سلسلہ میں جذبہ خلوص کو بڑی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ شہر حیدرآباد میں اس سلسلے میں قابل ذکر کام ہوتا رہا ہے۔ بہادر یار جنگ اور ان کے رفقا نے اقبال کی زندگی میں یہاں درسِ اقبال کی بنیاد رکھی جس میں دانشوروں کی ایک کہکشاں پابندی سے شامل رہتی۔ اس فضا میں نئے سیاسی موسم کے بعد یہاں خلیل اللہ حسینی صاحب کی مساعی سے اقبال اکیڈیمی کا وجود عمل میں آیا۔ شہرِ حیدرآباد میں اقبال اکیڈیمی کے تعاون سے ہر ہفتہ' اقبال شناسی کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ بزرگوں کی شفقت اور دوستوں کی خواہش پر یہاں فکرِ اقبال کی اسلامی جہت سے متعلق بے شمار لیکچرس منعقد ہوئے۔ حالانکہ میرے کالج کے دوستوں کا ایک حلقہ معترض تھا کہ تخلیقی کام اور دوسرے تصنیفی کام چھوڑ کر ساری توجہ اقبالیات پر مرکوز ہوگئی ہے۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ وقت کے مختلف موڑ پر اقبالیات سے رشتہ استوار رہا۔

اقبالیات سے یہ رشتہ مستحکم رہنے کے نتیجے میں چند مضامین کتاب کے روپ میں آپ کے سامنے پیش ہیں۔ توقع ہے کہ اقبالیات سے متعلق اردو میں اس کتاب کو پذیرائی ملے گی۔ اس سے میرے انگریزی مضامین اور تحقیقی مقالہ کی اشاعت کے لئے نئی راہیں کھل جائیں گی۔ خدا سے دعا ہے کہ میری اس کوشش کو قبولیت کا درجہ نصیب ہو۔

یُوسُف اعظمیٰ
13-6-437/1/B/13
پیرامونٹ کلاسک' قادر باغ'
حیدرآباد500 008۔

اقبال کی شاعری کے ادبی اور فکری سرچشمے

اقبال ایک فلسفی، دانشور اور شاعر تھے۔ ان کی ابتدائی شاعری پر گہرے رومانی اثرات ملتے ہیں۔ وہ دہلی مکتب فکر اور لکھنو مکتبِ فکر سے یکساں متاثر رہے ہیں۔ دہلی مکتب فکر کی خصوصیات میں جذبہ اور حسن ِ خیال کو زیادہ اہمیت تھی جب کہ لکھنو اسکول میں زبان اور تغزل پر زُور دیا جاتا تھا۔

لیکن اقبال ان دونوں مکاتب کی رفاقت کے ساتھ ساتھ ان میں شامل Native Arrogance سے نالاں تھے۔ اقبال کا تعلق پنجاب سے تھا جو اردو کے بنیادی مراکز سے دور تھا۔ تاہم یہاں ادیبوں اور شاعروں کا ایک غیر معمولی اہم قافلہ نظر آتا ہے۔ لیکن دہلی اور لکھنو کے مراکز پنجاب کے دامن میں نشو ونما پانے والی زبان کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اقبال نے اس سلسلہ میں اپنے مکاتیب میں زبان کے تخلیقی عمل پر زور دیتے ہوئے ایک نیا لسانی شعور دیا۔ اُن کی زبان پر کئی اعتراضات ہوئے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا نے ان کے تخلیقی عمل کو صحیح پس منظر میں سمجھا اور شاعر مشرق کے لسانی انحراف کو اہمیت ملی۔

اسکول میں طالب علمی کے دور میں ارشد گورگانی ' دہلی مکتب اور ناظم لکھنوی مکتب کے اثرات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ دونوں مکاتبِ فکر سے ان کا رابطہ برقرار تھا۔ بعد میں اقبال نے داغ کو جو اس وقت اہم شاعر تھے اور دہلی اسکول سے تعلق رکھتے تھے اصلاح کے لئے اپنی شعری تخلیقات روانہ کیں۔ داغ کے اثرات سنہ 1905ء تک اقبال کے کلام میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی شاعری کا پہلا دور ہے۔ تاہم اس دور میں مذہبی حسیت بھی ان کے ہاں آہستہ آہستہ ابھرتی نظر آتی ہے۔ مخزن کے ادبی کلچر کے اثرات کی بھی جھلک ملے گی۔ اقبال نے کئی انگریزی نظموں سے تراجم کیے۔ ''ہمدردی'' ...... ''عشق و موت'' ...... ''رخصت اے بزمِ جہاں'' ...... ''ایک پہاڑ اور گلہری'' جیسی تخلیقات پیش کیں جو تراجم کی اہم مثالیں ہیں۔ یہہ دراصل Transcreation کا عمل ہے۔ ترجموں کی آزادانہ فضا میں دراصل یہ نظمیں ماخوذ ہیں۔

تخلیقی زندگی پر اس عہد کے شاعروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مشاعروں کو اردو تہذیب کی تشکیل اور لسانی فضا کے تسلسل میں عملِ تکسید کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس تہذیبی فضا کے علاوہ صوفی لٹریچر اور وحدت الوجود کے تصورات کا عکس بھی اس دور میں نظر آتا ہے۔ اس طرح اقبال نے مختلف اداروں مکاتبِ فکر اور سرچشموں سے توانائی اور تخلیقی تازگی حاصل کی۔

شاعرِ مشرق کے شعری سفر کو مختلف ناقدین اپنے اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں

۔تفہیم اور شناخت کے لئے اس شعری سفر کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ابتدائی دور' آغاز سے 1905ء تک محیط ہے جب کہ دوسرا دور 1905ء سے 1908ء پر مشتمل ہے۔ تیسرا دور 1908ء سے 1918ء یورپ سے واپسی تک' چوتھا دور 1918ء سے 1932ء کا احاطہ کرتا ہے۔اس کے بعد پانچواں دور ایک طرح سے دوبارہ انہیں مسلکِ تصوف سے مربوط کرتا ہے۔اس طرح کی تقسیم یا زمرہ بندی سہولت کے لئے ہے ورنہ تخلیقی سفر کو کسی ایک مرحلہ یا موڑ پر تبدیلی کے عمل سے دوچار سمجھنا مناسب نہیں۔

ان کی شاعری میں رومانیت اور کلاسیکیت کا حسین امتزاج جھلکتا ہے۔رومانی شعرا کی طرح وہ خلوص اور تڑپ کو شاعری میں اہمیت دیتے ہیں۔کلاسیکیت' زبان کے سانچوں کو برتنے میں نظر آئے گی۔علائم بھی ان کی شاعری میں بڑی نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ایس۔اے۔واحد نے اردو' فارسی شعری روایتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس جانب توجہ مبذول کروائی کہ اقبال کے ہاں رومانیت' کلاسیکیت کے ساتھ علامت نگاری (Symbolism) کے عناصر کا واضح پتہ چلتا ہے۔اس کے برخلاف شمس الرحمٰن فاروقی نے ابتدا میں اپنے انگریزی مضامین کے ذریعہ اس بات پر اصرار کیا کہ اقبال کی شاعری میں علامتوں کا استعمال نہیں ہے بلکہ اکہرے پن کی وجہ سے انہیں علامتیں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ہارڈنگ کے حوالے سے وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔لیکن صرف لفظ لالہ کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا استعمال کبھی تنہائی کبھی تہذیب اور کبھی اسلامی ورثہ

کے سیاق وسباق میں جس طرح نظر آتا ہے ہم اس کی علامتی اہمیت سے انکار نہیں دیا سکتا۔

- اسی طرح بے شمار علامتیں ان کی شاعری کا حصہ ہیں۔ ان کی شاعری میں فکر کی طاقت ہے اور علامتوں کی شفافیت بھی۔

اقبال کی فکر اور بصیرت کے سرچشمے داغ کے شعری رویوں میں اسیر نہیں ہو سکتے تھے۔ اردو شاعری کے دو بڑے نام میرؔ اور غالبؔ کی شعری عظمت سے انکار ممکن نہیں۔ اقبال کی فکر کے لئے غالبؔ ایک شعری نصب العین ہے۔ غالبؔ کی شاعری فکر اور جذبہ کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ ان کی شاعری میں فلسفیانہ گیرائی اور نفسیاتی گہرائی کے پرتو ہیں۔ زندگی، ذوق، شرارہ، آہو، محبت، انا، شوخی، اس طرح جذبوں سے سرشار لہریں عجب نہیں کہ غالبؔ کی شعری دنیا سے ان کی کشید ہوئی ہو۔ دونوں کی شاعری کی شناخت اس طرح دیکھی جا سکتی ہے کہ غالب نے اپنے آپ کو ''عندلیب گلشن نا آفریدہ'' کہا ہے جب کہ اقبال نے ''من فردا'' سے اپنی بات منوائی ہے۔ غالب اور اقبال کے ہاں تصوف کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ وجودی تشویش، انسان دوستی کی مثالیں بھی ہیں۔ دونوں نے سبک ہندی میں لکھا اور انسانی آزادی کے لئے اپنے آپ کو وقف کیا۔ دونوں کی شعری شخصیتوں کے درمیان فرق بھی ملتا ہے۔ اقبال یقین پر زور دیتے ہیں اور ان کے شعری سرمایہ میں تشکیک کم ہے۔ جب کہ غالبؔ کے ہاں تشکیک ایک اہم حصہ ہے۔ اس ذہنی فاصلے کے باوجود اقبال نے غالبؔ کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

(مرزا غالب۔ بانگ درا)

غالب اردو شاعری کا ہی اہم ورثہ نہیں بلکہ عالمی ادب کی توانا شعری آواز ہیں۔ جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے اوما شنکر جوشی کے خیال کے مطابق غالب کالی داس کے بعد ہندوستانی شاعری کی سب سے بڑی آواز ہے۔

اقبال خوش قسمت تھے کہ انہیں میر حسن' آرنلڈ اور براؤن کی رہنمائی حاصل رہی۔ شبلی کی شخصیت کا نکھار بھی ان کی تحریروں میں ملے گا۔ علم الاقتصاد کی اشاعت میں شبلی نے ابتدائی کام کی اصلاح کی تھی۔ اقبال نے عصری حالات' تاریخ اور اسلامی واقعات کے حوالے شبلی کے زیر اثر اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ یہہ شاعرِ مشرق کی فکری طاقت اور شعری توانائی کا یہ ایک سرچشمہ ہے۔ ''صدیق'' ''ہمدردی'' ''ماں اور بچہ'' ''ایک مکڑا اور مکڑی'' ''ایک گائے اور بکری'' جیسی تخلیقات اس کی مثالیں ہیں جہاں واقعات اور بیانیہ اظہار کی کئی مثالیں جلوہ گر ہیں۔

شبلی کے ہم عصر خواجہ الطاف حسین حالی' غالب کے شاگرد تھے۔ انھوں نے مدو جزرِ اسلام (مسدس حالی) کے ذریعہ زبردست مقبولیت حاصل کی۔ 1857ء کے المناک حالات' مغلیہ سلطنت کی شام' برطانوی سامراج کے مظالم کی داستانیں

سنائیں۔ مسدس نے مسلم سماج کے شعور کو بیدار کیا۔ ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' پر مسدس کی پرچھائیاں نظر آئیں گی۔ حالی نے دردناک حالات کی تصویر کھینچی اور وہ ایک نسل کے شعور اور حافظہ کا حصہ بنی۔ مگر حالی کے غیر معمولی خلوص کے باوجود ان کے بعض Limitations کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اقبال کی طرح شاعرِ فردانہ تھے۔ حالی نے شاعری میں اصلاح کی کوشش کی۔ اس کی روشنی میں مقدمہ شعر و شاعری جدید عہد کا پہلا شعری مینی فیسٹو ہے۔ اخلاقی نقطہ نظر کے ذریعہ انھوں نے اسلاف کے کارناموں کے پس منظر میں شاعری کو پیغام کا ذریعہ بنایا جب کہ اقبال کے ہاں کھوئے ہوؤں کی جستجو کے ساتھ فردا پر بھی گہری نظر ہے۔

اقبال کی شاعری پر اکبر الہ آبادی کا رنگ بھی ایک دور میں نمایاں ملتا ہے۔ بانگِ درا کا ظریفانہ کلام ان اثرات کی شہادت دیتا ہے۔ اکبر مغربی تہذیب کے خلاف تھے۔ دہریت کے اثرات کے امکان کی وجہ اقبال بھی اس نقطہ نظر کے حامی تھے۔ دونوں کے درمیان ایک فرق ملتا ہے۔ اقبال مغرب کی سفاکیت کے علاوہ اس کے فعال روپ کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ ایک نئی مشرقیت کے حامی ہیں۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد برصغیر قدروں کے بحران سے دوچار رہا۔ ان حالات میں ایک مکتبِ فکر نے مغرب سے گریز میں عافیت سمجھی اور دوسرے مکتبِ فکر نے مغرب اور مشرق کی صحت مند قدروں کے امتزاج کو سیاسی اور سماجی حقیقت کے روپ میں دیکھا۔

اقبال کی فارسی شاعری نے کئی سرچشموں سے اکتساب کیا۔ فارسی شعری روایت سے ان کی گہری واقفیت ان کے شعری سفر اور وسیع تر سطح پر ترسیل میں معاون رہی۔ اردو اور فارسی روایات کا ایک دوسرے سے بہت قریبی ربط رہا ہے۔ فارسی شعرا کی کہکشاں میں رومی کے علاوہ فردوسی' انوری' سعدی' حافظ' نظامی' امیر خسرو' بیدل' جامی' خاقانی' عرفی' عطار' غالب اور غنی کشمیری ہیں۔ مگر حکیم الامت کی شاعری میں مرکزی اثر جلال الدین رومی کا ہے۔ اقبال نے خود کو مرید ہندی کی حیثیت سے تعارف کروا کے ان اثرات کا کھلا اعتراف کیا ہے۔ خودی کی مرکزیت' صوفیانہ مسلک سے وابستگی' عقل اور وجدان کے درمیان کشمکش' جلال الدین رومی کی شاعری سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے۔ این میری شمل نے **The Triumphal Sun** میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اقبال نے مولانا روم سے مکمل اکتساب نہیں کیا۔ رومی کے فکر کی ایک کرن اقبال کے کلام میں ملتی ہے۔ اسرار خودی میں ہم فارسی روایات کا تسلسل دیکھ سکتے ہیں جہاں مولانا روم کے علاوہ نظیری کی جستجو بھی شاعرِ مشرق کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتی ہے۔

حافظ' فارسی شاعری اور عالمی ادب کی غیر معمولی اہم شعری آواز ہیں۔ انہوں نے مشرق ہی نہیں مغرب کو بھی متاثر کیا ہے۔ اقبال اور حافظ کے ذہنی رشتے بڑے عجیب ہیں۔ **اسرارِ خودی** میں انھوں نے حافظ پر شدید تنقید کی لیکن یہ تنقید ادبی اصولوں کے بجائے سماجی اور سیاسی حالات کے پیشِ نظر زیادہ معنویت رکھتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبال

نے خود یہ اعتراف کیا: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حافظ کی روح مجھ میں حلول کر گئی ہے۔ پیکر تراشی 'استعارے' شعری ارتکاز میں وہ حافظ سے بہت قریب ہیں۔ حافظ کے علاوہ عبدالقادر بیدل سے بھی وہ غیر معمولی متاثر رہے ہیں۔ انھوں نے بیدل کو مرشدِ کامل کہا۔ ایک وقت کچھ نوجوان اقبال کے ہاں حاضر ہو کر ان سے یوم اقبال منانے کی بات کرنے لگے تو اقبال نے تلقین کی کہ مرشدِ کامل بیدل کا یوم منایا جائے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اقبال کس طرح بیدل کو غیر معمولی اہم شاعر تصور کرتے تھے۔ یہ ایک ادبی حقیقت ہے کہ اردو کے دو اہم شعرا غالب اور اقبال پر بیدل کے گہرے اثرات ہیں۔

فارسی شاعری سے تو اقبال نے کافی اکتساب کیا لیکن عربی شاعری سے ان کے رشتے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مجازی لے اور عربی کلاسیکیت ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' ظاہری سطح پر نامیاتی وحدت کی کمی کے باوجود ایک شعری شاہکار ہے۔ مسجد قرطبہ کو عربی شاعری میں تاریخی اور ادبی نقطہ نظر سے بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ کئی عربی شعرا نے اس کو اپنی اپنی تخلیقی توانائی کا حصہ بنایا۔ اقبال نے ایک وسیع کینوس پر اس کا نقشہ کھینچا ہے۔ جاوید نامہ میں طواسین بھی عربی روایت کا تسلسل ہیں۔

عربی اور فارسی روایات کے علاوہ پنجاب کی اس سر زمین کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس کے خمیر سے اقبال کی زندگی گوندھی ہوئی تھی۔ ان کی شاعری میں ظاہر پرستی کے خلاف بھرپور آواز دراصل پنجابی شاعری کی دین ہے۔ اس کے علاوہ تصوف سے

کشش اور گریز کی مثالیں یہاں کے ماحول کی عطا ہیں۔ پنجابی کلچر کا اردو سے تہذیبی اور جغرافیائی ربط رہا ہے۔ اقبال کی شاعری میں اس کلچر کی موجیں اور اُن کی صد رنگ جھلکیاں ہیں۔

انگریزی شاعری اور خاص طور سے رومانیت سے اقبال نے ابتدائی دور میں اپنے آپ کو بہت قریب پایا۔ انھوں نے Stray Reflections (بکھرے خیالات) میں اس بات کا اعتراف کیا کہ ورڈس ورتھ کی شاعری نے انہیں دہریت سے بچانے میں نمایاں رول ادا کیا۔ انگریزی ادب کی اس تیسری عظیم شعری آواز کا دامن فطرت کے علاوہ عیسائی شعور اور اخلاقیات سے عبارت ہے جب کہ اقبال کی شاعری میں اسلامی مابعد الطبیعیات کے عناصر ہیں۔ دونوں شاعروں نے صنعتی عہد کی دردناک جبریت کا شکار ہونے والے سماج پر شدید تنقید کی ہے۔ شاعرِ مشرق نے ایک مفکر کے حوالے سے یہ بات کہی ہے۔ احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات۔ تاہم ورڈس ورتھ اور اقبال کے درمیان شعری فاصلے بھی ہیں۔ ورڈس ورتھ نے شاعری کو جذبوں کا بے ساختہ بہاؤ قرار دیا جب کہ اقبال شاعری کو زندگی اور شخصیت کے تابع محسوس کرتے ہیں۔ وہ انفس اور آفاق کے درمیان گہرے ربط کو اہمیت دیتے ہیں۔ فطرت کی فعالیت جیسے بہتے چشمے کو ہساروں کی عظمت ان کے ہاں زیادہ نمایاں ہے۔ ان کی رومانیت فطرت میں اپنی شناخت گم نہیں کرتی۔

انگریزی کے ایک اور عظیم شاعر ملٹن کے کلام میں خیر و شر کا مسئلہ بہت اہم ہے۔
ملٹن کے کلام میں اور شعرِ اقبال میں مماثلتیں ملتی ہیں۔ اقبال براؤننگ سے بھی متاثر تھے۔
بکھرے خیالات (Stray Reflections) میں اس بات کا واضح اعتراف ہے۔
براؤننگ کے ہاں زندگی کے مثبت تصورات کے ساتھ خوبصورت پیکر ملتے ہیں۔ اقبال نے
اپنی ڈائری میں ورڈس ورتھ کے علاوہ براؤننگ کا خصوصی تذکرہ کیا ہے۔

مشرقی اور مغربی ماخذوں کو شاعر نے بڑی خوبی سے برتا ہے۔ جرمن فکر سے
ان کا گہرا تعلق تھا' کانٹ' ہیگل اور نٹشے کے افکار پر کسی نہ کسی سطح پر ان کے ہاں نظر آئیں
گے۔ پیامِ مشرق گوئٹے کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ گوئٹے' حافظ سے غیر معمولی متاثر
رہے ہیں۔ مغرب میں عمر خیام اور حافظ کی شاعری کے اثرات فارسی روایات کے ذریعہ در
آئی ہیں۔ اقبال جہاں ایک سطح پر فارسی روایات کا انوٹ حصہ ہیں تو دوسری سطح پر وہ گوئٹے
سے متاثر ہیں۔ ایما ویگے ناست کے نام لکھے ہوئے خطوط میں گوئٹے کا خصوصی ذکر ملتا
ہے۔

جاوید نامہ میں غالب اور گوئٹے کا ایک تقابلی ذکر بھی ملتا ہے۔ گوئٹے اور اقبال
دونوں کے ہاں رومانیت اور کلاسیکیت کے ساتھ ایک خوبصورت توازن ہے۔
این میری شمل نے پیامِ مشرق اور جاوید نامہ پر ان کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔
جاوید نامہ اور ڈیوائن کامیڈی میں قدرے مماثلت نظر آئے گی۔ تاہم ڈانٹے'

اقبال کے لئے سرچشمہ تحریک نہیں تھے' بلکہ ان کی حیثیت سید عبداللہ کے مطابق ایک Stimulant کی سی تھی۔ ڈیوائن کامیڈی' خالص عیسائی پس منظر میں لکھی گئی ہے اور جاوید نامہ مابعد الطبیعیاتی' تاریخی اور تہذیبی پس منظر کی عکاسی کرتا ہے۔ اس بات کا صحیح پتہ نہ چل سکا اقبال جیسے سچے عاشقِ رسولؐ نے ڈیوائن کامیڈی جیسی تخلیق سے اس طرح یگانگت کیسے محسوس کی۔ ادبی نقطہ نظر سے ایلیٹ اور دوسروں نے اس کے گن گائے ہیں مگر اخلاقی تہذیبی اور انسان دوستی کے پس منظر میں ڈیوائن کامیڈی کے بعض حصے قابل مذمت ہیں۔ ڈانٹے کے ذہن اور جذبہ کی گندگی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ معراج کے قصوں کو بغیر کسی حوالہ کے استعمال کرنے والے سارق کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ تعصبات کی فضا میں وہ رحمت عالمؐ سے بے بہرہ ہے۔ آسین کی تحقیق کے مطابق معراج کے واقعات اور فتوحات مکیہ سے ڈانٹے اور دوسروں نے اکتساب کیا۔ جاوید نامہ' معراج کے واقعات کے پس منظر میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ واقعات مسلمانوں کے اجتماعی حافظہ کا انوٹ حصہ ہیں۔

شاعرِ مشرق نے ایک تخلیقی فن کار کی طرح اپنی فکر اور شعر میں مختلف روایتوں سے اکتساب کیا۔ یہ ادبی اور فکری سرچشموں اور عالمی ادب کی عظیم فن کارانہ شخصیتوں سے مربوط ہے۔ ماخذ مختلف ہیں لیکن اقبال نے ایک Genius شاعر کی حیثیت سے اکتساب کو اس طرح اپنی شعری شخصیت اور ذہنی سرمایہ کا حصہ بنایا کہ ان کی تخلیقی آنچ

وژن میں سموگئی۔ان کے ہاں کئی روایتوں کی صدرنگ موجیں ایک دائرہ بناتی ہیں اور ان کے دل کی موج نئے سفر سے روشناس کراتی ہے۔اس طرح روایت ان کی آفاقیت کی اشاریہ ہے اور انفرادیت'ان کی شخصیت کا جیتا جاگتا پیکر۔

اقبال کی شاعری کے نظام میں جمالیات کی بڑی اہمیت ہے۔ان کے پیغام کی شدت' طاقت اور جلال پر مسلسل زور سے یہ تصور ابھرنے کا پورا امکان ہے کہ ان کی شاعری میں جمالیات کا پہلو تشنہ ہے۔لیکن یہ مکمل حقیقت نہیں ہے:

رہے نہ ایبک وغوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

خونِ رگ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بُت خانۂ بہزاد

اقبال دنیا کے چند عظیم شاعروں کی صف میں نظر آئیں گے۔ان کی شاعری ہمارے ذہن' جذبوں اور شعور کا ایک انوٹ حصہ بن گئی ہے۔عصرِ حاضر کی تاریخ میں فکر و فن

کے ذریعہ ایسا دیرپا گہرا اور وسیع تر اثر مرتب کرنے والی شخصیتیں کم کم ہی ملیں گی۔ ہم کسی بھی شاعر کو خالص مغربی یا خالص مشرقی پیمانوں سے نہیں ناپ سکتے۔ مغربی تنقیدی زاویوں کو جب ہم مشرقی سانچوں پر منطبق کرتے ہیں تو جہاں تحسین اور تفہیم کے نئے امکانات ابھرتے ہیں وہاں ایک خطرہ درپیش رہتا ہے کہ بہت سے گوشے پہنچ سے دور رہ جاتے ہیں۔ اس لئے شاعری اور ادب کی تنقید میں مختلف اصناف کی خصوصیت اور تہذیبی فضا کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اقبال کی شعری کائنات کھوئے ہوؤں کی جستجو سے عبارت ہے مگر یہ عصری دنیا کے تناؤ کو اپنے وجود میں سمیٹ کر فردا کی طرف گامزن ہے۔

دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم وجدید

شاعرِ رنگین نوا دیدہ بینائے قوم ہے۔ اقبال نے جو بات اپنی نظم "شاعر" میں کہی ہے اس کے آئینے میں خود ان کی شخصیت کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ ان کی شاعری سے اہل زمین کو زندگی کے دوام کا نسخہ ہاتھ آتا ہے کیونکہ یہ وہ سخنوری ہے جو دردانگیز نالوں میں ڈھلی ہے اور خونِ جگر سے اس کی تربیت ہوئی ہے۔ ان کی شعری کائنات تصویر درد ہے۔ شاعر وہ پیغمبرانہ وصف رکھتا ہے کہ بامِ عرش کے طائر اس کے ہم زبانوں میں ہیں۔

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

شاعرِ مشرق نے تنقید کے اس سحر کو توڑا کہ مذہبی حسیت

(Religious sensibility) کی شاعری بڑی شاعری نہیں ہوتی ۔اقبال کی شعری کائنات کی سیر ہمہ جہتی ہونی چاہیے۔مطالعۂ اقبال الگ الگ خانوں میں ممکن نہیں ہے۔شاعرِ اقبال اور دانشور اقبال کے درمیان فصل نہیں ہے بلکہ ایک تخلیقی اور نامیاتی وحدت ہے۔ایک ہمہ جہتی تنقید ہی شعرِ اقبال کی تفہیم اور تعبیر کا حق ادا کرسکتی ہے۔

اقبال کی شاعری میں کتنی آوازوں کی گونج ہے۔ایک سمفنی کی طرح Musical Notes خوبصورت امتزاج میں ڈھل جاتے ہیں ۔سات سُروں کی کہکشاں میں ان کا آٹھواں سر بھی شامل رہتا ہے جس سے ان کی شناخت متعین ہوتی ہے۔کلامِ اقبال میں مذہبی سرچشمے ہیں' تہذیب وتمدن کی رعنائیاں ہیں' قوموں کا عروج وزوال ہے' تاریخ کے دھارے ہیں' عصرِ حاضر کی تحریکیں ہیں' سماجی حقائق' انسانی جدوجہد کی داستانیں' اوران کے ساتھ فکرو دانش کی شمعیں ہیں جن کی کرنیں' مشرق ومغرب سے پھوٹتی ہیں۔سائنس کے تجربات ہیں' فلسفوں کی کشاکش ہے' کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے' تازہ بستیوں کے امکانات ہیں' اساطیری رجحانات ہیں Being اور Becoming کا عمل ہے۔اس طرح مختلف ستاروں کی کہکشاں کے درمیان ایک کشش کا عمل ملے گا۔نئے ادبی رجحانات اور تھیوری Theory کی روشنی میں ان کے کلام کی منفرد خصوصیات جلوہ گر ہوتی ہیں۔ساختیات' پس ساختیات اور ردِ تشکیل Deconstruction کی روشنی میں شعر کی نئی تفہیم حاصل ہوتی ہے۔

اقبال کی غزل میں روایت اور انحراف

اُردو غزل میں صدیوں کے دامن میں نکھری ہوئی ادبی روایات بڑی مستحکم ہیں۔
اردو شاعری کے سفر نے اس صنف کو نئی نئی تبدیلیوں سے ہم آہنگ کیا۔غزل اپنے مزاج' اختصار کی جامعیت' منفرد اظہار اور سبک جذبوں کی وجہ سے عالمی ادب میں ایک خاص مقام کی حامل ہے۔ یہ صنف ہمارے خوبصورت جذبوں اور تہذیب کی علامت ہے جہاں احساسات ایک خاص کیفیت اور انداز سے ایک کہکشاں میں ڈھلتے ہیں۔ستارے جس طرح اپنا الگ وجود رکھتے ہوئے ایک کشش میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں' غزل کے شعر متضاد کیفیتوں کے باوجود موتیوں کی طرح ستاروں کی لڑی میں ملیں گے۔اردو شاعری کے کلاسیکی دور میں بساطِ ادب پر غزل ہی کی حکمرانی رہی ہے۔عصرِ جدید میں نظم کو بھی اعتبار ملا۔

کلیم الدین احمد نے صرف مغرب کی ادبی قدروں ہی سے اس صنف کو جانچنے کی غلطی کی۔ یہہ سچ ہے کہ غزل کچھ انتشار کا شکار رہی۔اسی لئے الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں غزل کی اصلاح کا خاکہ پیش کیا۔وہ غزل کو اخلاقی قدروں کا

ترجمان بنانا چاہتے تھے اور جذبوں کے بے پناہ پھیلاؤ کو ایک خاص سمت میں فوکس کرنا چاہتے تھے۔ ترقی پسند تحریک نے اس کے برخلاف غزل کو مارکسزم کی منزل کے لئے ناموزوں سمجھ کر نظم کو وسیع تر ذریعہ اظہار کے لیے اپنایا۔ غزل دار و رسن کی بے شمار منزلوں سے گزر کر آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ جدید دور نے غزل کو نئی وسعت بخشی۔ اب یہ ہمارے ادبی کلچر میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ اس سے دامن بچانا ممکن نہیں ہے۔

شاعری میں روایت اور انفرادی صلاحیت کے درمیان کشاکش ایک کٹھن مسئلہ ہے۔ تخلیق کے لئے طرزِ کہن اور تجربہ سے مربوط ایک خوبصورت تسلسل ضرور ملتا ہے مگر نئی سوچ اور طرزِ فکر سے گھبراہٹ تخلیقی چشموں کو خشک کر دیتی ہے۔ تخلیق کے لئے تجربہ ناگزیر ہے ورنہ تخلیقی عمل ایک میکانیکی تکرار بن جاتا ہے۔ یوں بھی بیسویں صدی تیز رفتار تبدیلیوں سے عبارت رہی ہے جہاں زندگی کے مختلف شعبوں، فنون اور ادب میں انقلابی تبدیلیوں کا ظہور ہوا۔ اکیسویں صدی اس کی توسیع ہے۔

اردو نظم میں شعری تجربوں کو آسانی سے قبول کر لیا گیا۔ اس صنف کے ابتدائی دور سے نثری نظم تک تجربوں کی قبولیت اور گریز کا ملا جلا ردعمل ملتا ہے۔ مگر اردو غزل میں تجربہ کو ایک عرصہ تک شجرِ ممنوعہ کی حیثیت حاصل رہی۔ جزوی تبدیلیاں تو شرفِ قبولیت حاصل کرتی رہیں مگر کوئی انقلابی تبدیلی غزل کے سانچے میں ممکن نظر نہ آئی۔ اب نئی غزل

کے سفر نے نئے استعاروں، تشبیہوں، علامتوں اور جزوی فنی انحراف کے ذریعے اس صنف کو بدل ڈالا ہے۔ قدامت پسندی سے جدیدیت اور مابعد جدیدیت تک ایک طویل سفر ہے مگر اقبال کے عہد میں زبان کا بُت، روایات کا اسیر ہونا، انفرادی تبدیلی سے زیادہ تحفظ کے عناصر پر زور، علاقائی مکاتب کے اثرات، ادب اور سماج کی تیز رفتار تبدیلیوں کے لئے راہ کے پتھر رہے ہیں۔ صدیوں سے بنا ہوا ایک مخصوص سانچہ تھا جس میں کسی بنیادی تبدیلی کا احساس، روایت میں جکڑا ہوا ذہن قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

اقبال کی غزل کے تخلیقی عمل کے ساتھ یہی ہوا۔ انہوں نے ابتدائی دور میں داغ کے مکتب سے عارضی وابستگی کے نتیجے میں ہلکی پھلکی، چھیڑ چھاڑ والی غزلیں کہیں۔ ان غزلوں میں کلاسیکی روایات کا احترام ملتا ہے۔ یہ ہلکی پھلکی اور سطحی نوعیت کی غزلیں دراصل سفر میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جب اقبال نے غزل کے سفر کو فکر اور خیال، نئی لفظیات کے امتزاج سے ایک نئی سمت دینے کی کوشش کی تو ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ مگر ان کا شعری سفر موج سے لہر بنتا رہا۔ ایک عظیم فن کار تنقید کے مروجہ اصولوں اور روایات کا اسیر نہیں رہ سکتا۔ فن میں تجربوں کی دنیا جب سامنے آئے تو تنقید کو اپنی قدریں بدلنی پڑتی ہیں۔ اگر فن کار تنقید نگاروں کے بنائے اصولوں یا منجمد روایات کی روشنی میں تخلیقی سفر کو سمت دینے کی کوشش کرے تو فطری بہاؤ میں ٹھہراؤ آ جائیگا۔ شاعرِ مشرق اس المیہ سے بچ گئے اور غزل کو

ایک نئی جہت دینے میں کامیاب رہے۔اس نئی جہت میں نئے تصورات کی مہک ہے:
علامتوں کا اشاریہ ہے؛ قدیم سانچوں کی شکست وریخت اور تازگی سے سرشار تخلیقی عمل
ہے۔اقبال نے نہ صرف اردو نظم کے سرمائے میں غیر معمولی اہم اضافے کیے بلکہ غزل
کی دنیا میں بھی ان کی عطا بہت اہم ہے۔غالب نے غزل کو اس قابل بنایا تھا کہ وہ فکر کا
دلکش سبک بوجھ اپنے نازک سانچوں میں سمو سکے۔اقبال نے اس روایت کو تسلسل اور
استحکام بخشا۔

بعض نقادوں کے خیال میں غزل انتہاؤں کا ایک سلسلہ ہے جہاں حیات و
کائنات کے بے شمار مسائل مترنم محسوسات میں ڈھل جاتے ہیں۔اقبال کی شعری تخلیقات
میں بشمول غزل جس طرح حیات و کائنات کے مسائل پیش کیے گئے ہیں کسی اور فنکار کی
شعری تخلیقات کا اس طرح منفرد انداز میں ملنا دشوار ہے۔ان کی غزل عظیم روایات کا چشمہ
ہے: ہماری تہذیب کی آبرو ہے اور مستقبل کی خوبصورت پرچھائیوں کا اشاریہ بھی۔غزل کا
ارتکاز' وسیع کینوس' وضاحت سے احتراز اور ابہام کی پراسرار پہنائیوں میں چھپے جذبوں کی
رونمائی ہے۔یہ بات چاہے جذبے سے متعلق ہو یا فکر سے۔حکمت و فلسفے کی دنیا ہو کہ
تصوف کی دھندلی دھندلی پراسرار فضا؛ مذہب کا سرچشمہ رہے یا غیر مذہبی۔وجودی انسان
:روایت کی خوبصورت کڑیاں ملیں کہ بغاوت کا جلال' جمال ہو کہ آرائش خم کاکل' غزل کی
شعری کائنات میں ان کے اظہار کی گنجائش ہے۔ایک عظیم فنکار ادبی روایات کا احترام

کرتے ہوئے شعری سانچوں میں اپنی نفرادیت کو بھی سمو دیتا ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنے مشہور مضمون '' روایت اور انفردی صلاحیت ''Tradition and Individual Talent'' میں تبدیلی اورانحراف کے تعلق سے جو بات کہی وہ معنی خیز ہے۔ اقبال نے بھی کلاسیکی قدروں کا احترام کیا لیکن انھوں نے اس حصار میں اپنے آپ کو مقید نہیں کیا۔ روایات کا جبر فن کے لئے قاتل ہوتا ہے۔ W.H.Hayward نے فارم اور مواد کے حوالے سے اقبال کی اس انفردیت پر زور دیا ہے۔ تغزل درون بینی کی مدہوش فضا کی داخلیت میں ملتا ہے اور خارجیت کی تحیر آمیز دنیا میں بھی۔ غزل صرف چند سطحی اور سبک جذبوں سے مسلسل کھلواڑ کا نام نہیں جو آج سطحی مشاعروں کا شعار بن گیا ہے۔ اس عمل کی تکرار جذبوں کی تہذیب سے محرومی کا دوسرا نام ہے۔ یہ جگالی کا عمل شاعری کے زوال کا اعلان ہے۔

اقبال کے شعری سفر کے نقطہ آغاز پر بیسویں صدی کی نئی کروٹ کے باوجود داغ کے ہلکے پھلکے رنگ کی شاعری کا جادو بول رہا تھا۔ اقبال نے اپنے شعری سفر کی شروعات میں داغ اور امیر مینائی کو چند دنوں تک اپنا آئڈیل بنایا۔ مگر زیادہ دنوں تک یہ وابستگی برقرار نہ رہ سکی کیونکہ اقبال کی فکر جذبات کی ان لہروں اور سانچوں سے آگے جانا چاہتی تھی۔ انہوں نے غزل گوئی سے اپنی شاعری کا سفر شروع کیا اور ابتدائی دور میں شہرت بھی اس کے حوالے سے ملی۔ خاص طور سے اس شعر کی شروعات سے ادبی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے

قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

صدیوں میں رچی ہوئی غزل پر فنی اور لسانی نقطہ نظر سے تحدیدات کا تسلسل تھا۔ اقبال نے کچھ حد تک ان زنجیروں کو توڑا۔ رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ غزل میں کشید کرنے کی گنجائش کم ہے مگر اقبال کے بعد جدید شاعری نے اس کا اسلوب اور موضوعاتی ڈھانچہ بدل دیا۔ نئے سانچے سامنے آئے جن کا سلسلہ آزاد غزل' نثری غزل تک دراز ہوا۔ لیکن ان میں کچھ تجربوں کو ہی اعتبار مل سکا۔ اور کئی تجربے اعتبار کی مہر لگنے کے منتظر ہیں۔ جدید شاعری میں جو تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں' ان میں اقبال کے انحراف کا انقلابی دخل بھی شامل ہے۔ بظاہر ایسا محسوس نہیں ہوتا مگر اقبال نے اصناف کے درمیان سرحدوں کو جس انداز سے اور جس جرأت کے ساتھ توڑا ہے وہ مزید حوصلوں کا سبب بن سکا۔

اقبال نے جس طرح نظم کے استعاروں' تشبیہوں' پیکر تراشی کے عمل اور موضوعات میں انقلابی تبدیلی کی' اسی طرح غزل کی لفظیات اور موضوعات میں وسعت پیدا کی ہے۔ ان روایات سے انحراف کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔ بانگِ درا کے اشعار پر نظر ڈالیے۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اُسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

یہہ اشعار، داغ کے رنگ میں اظہار کے طریق کار سے مختلف ہیں۔انہوں نے داغ کے رنگ میں کہا تھا۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

بانگِ درا میں جو غزلیں ہیں وہ ناقدین کی رائے میں زیادہ معیاری نہیں ہیں۔ان میں سطحی اشعار کا کچھ حصہ آسانی سے مل جاتا ہے۔شعری سفر کی اس شروعات سے قطع نظر، بالِ جبریل کی غزلوں کا رچاؤ اور جذبوں کا گوندھا ہوا خوبصورت مرقع دیکھنے کے قابل ہے۔تاہم ان غزلوں میں جو انحراف کی مثالیں ملتی ہیں، ان پر فنی نقطہ نظر سے غزل کے طریق کار پر بحث کی گئی ہے۔آیا یہ غزلیں نظم کے دائرے میں آتی ہیں یا غزل کے دامن میں۔انہیں غزل نما نظم کہا جائے یا نظم نما غزلیں۔یا انہیں انحراف کی واضح مثالیں تصور کیا جائے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس کو انحراف سے تعبیر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا، غزل کے لئے اقبال کی عطا کو غیر معمولی تصور کرتے ہیں۔

بالِ جبریل کی غیر معمولی غزلوں میں فکری ارتکاز، تخیل کی معراج اور جمالیات سے بھرپور رعنائیاں ملتی ہیں:

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب لا مکاں تیرا ہے یا میرا

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے

عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی
ہر ذرہ شہیدِ کبریائی

بے ذوق نمود زندگی موت
تعمیر خودی میں ہے خدائی

تارے آوارہ و کم آمیز
تقدیرِ وجود ہے جدائی

یہ پچھلے پہر کا زرد رو چاند
بے راز و نیازِ آشنائی

ضربِ کلیم کی غزلیں بھی ہماری توجہ کی طالب ہیں۔ اس شعری مجموعہ میں مقصدیت کا عنصر غالب ہے جو صدیوں کے تغزل کے احساس کو مجروح کرتا ہے۔ لیکن کئی اشعار ایسے ملیں گے جن میں غزل کا بانکپن ہے۔

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیے ہیں تقدیر کے چاک

کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ

ان غزلوں نے ہمارے ذہنی افق اور جذباتی سرحدوں کو بے پناہ وسعت بخشی ہے۔ ان غزلوں کے اشعار پر نظر ڈالیے۔ اس سے جو Mosaic بنتا ہے' کتنا ہمہ جہتی ہے!

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

ترے نیستاں میں ڈالا مرے نغمۂ سحر نے
مری خاک پے سپر میں جو نہاں تھا اک شرارہ

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آگئی میسر مری شوخیٔ نظارہ

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

عشق کی اک جست نے طے کردیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے درد ناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

تو ہے محیطِ بیکراں ' میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر!

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے؟ یہ مکاں کہ لا مکاں ہے
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی

رشید احمد صدیقی نے جدید اردو غزل میں کہا ہے:

غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ ہماری
تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔ دونوں کو
سمت و رفتار' رنگ و آہنگ' وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے
۔۔غزل فن ہی نہیں فسوں بھی ہے' شاعری نہیں تہذیب بھی' وہ
تہذیب جو دوسری تہذیبوں کی نفی نہیں کرتی بلکہ ان کی تصدیق کرتی

ہے ۔۔ ہندوستان نے اردو کے آئینے میں پہلی بار جمہوریت کی تصویر دیکھی ۔۔۔ غزل ریزہ کاری میں میناکاری ہے ۔۔ غزل' غزل ہونے کے علاوہ ایک نقطۂ نظر' ایک اندازِ فکر' ایک اصولِ تلخیص اور سلیقہ اظہار بھی ہے ۔۔۔ اردو شعر و ادب میں غزل کا درجہ اُم الاسالیب کا ہے ۔۔ یہ کہنا حقیقت سے دور نہیں کہ ایک نامعلوم مدت تک غزل ہی نہیں بلکہ اردو شاعری کے جملہ اوصاف کا اعتبار و امتیاز اقبال کے دیئے ہوئے معیار سے متعین ہوگا ۔۔۔ بڑے شاعر کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ جس صنف سخن میں طبع آزمائی کرے اس کے ان اعلیٰ امکانات کو واضح اور متعین کر دے جو اس سے پہلے نامعلوم یا ناممکن سمجھے جاتے تھے ۔ غزل میں یہ کارنامہ غالب اور اقبال کا ہے ۔۔۔ اقبال نے اپنی غزلوں میں ہم کو یہہ محسوس کرایا کہ عشق و محبت دل ہی کا ماجرا نہیں ذہن کا بھی ہے غزل گوئی کا یہی سنگ بنیاد ہے ۔۔۔ اقبال نے غزل کی بزمیہ کو رزمیہ کے درجے پر پہنچ دیا ۔ انہوں نے غزل کو محفل سماع اور بزم ماتم سے نکال کر مجاہدوں کی صف اور دانش وروں کے حلقے میں پہنچ دیا ۔

رشید احمد صدیقی نے غزل کا ذکر دلنشیں انداز میں کیا ہے اور اقبال کی غیر معمولی عطا کی بھی وضاحت کی ہے۔ اقبال نے غزلوں کو بلند آہنگی عطا کی ہے۔ ان کی غزلوں میں مسرت سے بصیرت تک خوبصورت اور معنی خیز سفر ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی بصیرت کے ساتھ وسیع تر لسانی وسائل کو کام میں لاتے ہوئے غزل کے فارم میں بھی تبدیلیوں کے اشارے دیئے۔ اقبال کی عبقری شخصیت نے ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے کے مصداق تاریخی، تہذیبی اور لسانی تسلسل کے ساتھ ساتھ اس منفرد صنف سخن کو ایک نئی شناخت عطا کی۔ یہ کارنامہ اردو شاعری کے صدیوں پر محیط طویل سفر میں غیر معمولی اہم ہے۔

اقبال نے اردو شاعری میں فکر کے زاویوں ہی کو نہیں بدلا بلکہ اس کو فنی وسعتیں بھی عطا کیں۔ انہوں نے غزل اور نظم کے درمیان فصل کو کم کر دیا۔ غزل میں جذبوں کے تسلسل اور آہنگی کو اپنا شعار بنایا۔ اسی لئے ان کی بعض غزلیں تخلیقی عمل کے بعد، عنوانات کے تحت نظم کے زمرے میں شامل کی گئیں۔ کہیں کہیں انھوں نے غزل میں آخری شعر پر قافیہ کی تبدیلی کر دی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس کو ایک تجربہ تصور کرتے ہیں۔ آلِ احمد سرور نے تنقیدی نظر سے احتساب نہیں کیا لیکن اس بات کا ذکر ضرور کیا ہے کہ یہ غزل کے آداب کے منافی ہے۔ اقبال کے ذہن میں غزل کی ہیئت کی بنیادی تبدیلی بھی رہی ہوگی۔ لیکن قدامت پسند فضا میں اور ان کی غزل کی زبان پر غیر ضروری اعتراضات سے انھوں نے غالباً ہیئت کی تبدیلیوں کی طرف توجہ دینے کے بجائے مضامین کی وسعت، تشبیہات

اور علامتوں کی ایک نئی دنیا کے علاوہ پرانی علامتوں اور تراکیب کے Alchemisation کی عطا پر ہی اکتفا کیا۔ اس کے علاوہ شاعرِ مشرق اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ فنی تبدیلیوں کے لئے جو فرصت چاہیے وہ ان کے دامن میں نہ تھی۔

غزل لکھنا آسان بھی ہے اور دشوار بھی۔ آسان اس لئے کہ نظم کی طرح نامیاتی وحدت کی تلاش' فکر اور جذبوں کے تسلسل کی ضرورت نہیں رہتی۔ دشوار اس لئے ہے کہ غزل کے کلاسیکی سرمایہ میں اضافہ کرنا اور وہ بھی روایت کے اسیر ہوکر' قدرے دشوار ہوتا ہے۔ تاہم اقبال کی عطا کے نتیجے میں بعد کے دور میں جدید شاعری نے نہ صرف نیا لب و لہجہ دیا بلکہ تشبیہوں' استعاروں کی ایک دنیا کے ساتھ Modern sensibility کو پیش کیا۔ تاہم یہہ بات اپنی جگہ ہے کہ فکر کی وہ طاقت' جو اقبال کی غزلوں میں ہے وہ کم کم ہی ملتی ہے۔ جدید شاعری کے ایک بڑے طبقہ نے غالب کے فلسفیانہ انداز اور میر کی سادگی کو اہمیت دی۔

شاعرِ مشرق کے ہاں کئی شعرا کی عظمت کی داستانیں ملتی ہیں۔ مگر میرؔ کا ذکر کم کم ہی ہی ملتا ہے۔ پہلی بات تو یہہ ہے کہ میر کی سادگی اقبال کی فکر کے لئے وہ Space فراہم نہیں کرسکتی تھی جو اُن کے دل سے اٹھنے والی سمندر کی سی موجوں کی کشاکش کو سما سکے۔ دوسری بات یہہ ہے کہ میرؔ کے ہاں سوزِ غم' اداسی کے جذبات کا غالب اثر ہے جو اقبال کے ادبی نصب العین سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ اقبال نے اسی نصب العین کی وجہہ سے حافظ

پر شدید تنقید کی۔ بعد میں اعتراضات کی یلغار کی وجہہ سے تنقید کا حصہ حذف کر دیا۔ وضاحت میں انھوں نے ادبی نصب العین کو اپنی دفاع کے لئے پیش کیا تھا۔لیکن حقیقت تو یہہ ہے کہ سماجی اور تہذیبی قدروں کی روشنی میں انھوں نے یہہ فیصلہ دیا تھا۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے خیال کے مطابق ادبی قدریں اس بات کا تعین کرتی ہیں کہ کوئی تحریر ادبی ہے یا غیر ادبی تاہم اس کی عظمت سماجی' تہذیبی قدروں کی روشنی میں ممکن ہے۔ اقبال کے وجود میں کئی شخصیتیں تھیں سماجی مصلح کا کردار نبھانے والی شخصیت اور درد مند دل کے جذبوں سے معمور تخلیقی شخصیت۔ تاہم انھوں نے حافظ پر جو تنقید کی تھی جو غیر متوازن تھی اس طرزِ تنقید کے نتیجے میں ٹیگور کی شاعری ہی نہیں بے شمار عالمی سطح کے شعرا کا سرمایہ زد میں آتا ہے۔ اقبال نے اعتراف کیا کہ حافظ کی روح ان میں حلول کر گئی ہے۔ کشش اور گریز کے اس پس منظر میں اقبال کا ادبی نصب العین حقیقت میں لطیف تضاد کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان کا تصورِ خودی اس وقت کے سیاسی' سماجی حالات کی وجہہ سے غیر معمولی اہمیت حاصل کرتا رہا۔ اس کی وجہہ سے رومانی انداز' Utopian سرحدوں کو چھونے لگا۔ سماجی اور سیاسی حالات کی روشنی میں اس کا جواز ہو سکتا ہے لیکن خالص ادبی نقطۂ نظر سے توازن کی کمی کا بھی احساس ہوتا ہے۔

اک دانشِ نورانی ' اک دانشِ بُرہانی
ہے دانشِ بُرہانی ' حیرت کی فراوانی !

بیسویں صدی کے تاریخ ساز معاصرین:
اقبال اور ایلیٹ

بیسویں صدی کی دو قدر آور شخصیتوں اقبال اور ایلیٹ کی علمی اور ادبی کاوشوں اور وسیع تر مقاصد میں مماثلت ملتی ہے۔ معاصرین ہونے کی حیثیت سے بیسویں صدی کی ذہنی، علمی اور تہذیبی فضا میں ان کی نشو ونما ہوئی۔ ان دونوں کا جنم انیسویں صدی میں ہوا' مگر ان کی شعوری زندگی بیسویں صدی پر محیط رہی۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے 21 اپریل 1938 کو اقبال کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا۔ زندگی کی آخری سانس تک ان کے اندر توانا شاعر زندہ رہا۔ اس کے برخلاف ایلیٹ 5 جنوری 1965 تک زندہ رہے۔ لیکن تخلیقی سطح پر دوسری جنگ عظیم کے بعد انھوں نے اپنی توجہ ڈراموں کی طرف مبذول کردی۔ اس طرح ایلیٹ کی شعری زندگی کا وسیع کینوس' دوسری جنگ عظیم سے پہلے دیکھا جاسکتا ہے۔

بیسویں صدی کے ان دو بلاغت معاصرین نے فلسفے کے شعبے میں تربیت حاصل کی۔ اس ڈسپلن کے گہرے اثرات ان دونوں کی شاعری پر نظر آتے ہیں۔ فلسفہ' انسانی

ذہن کو سوچ کی وسعتیں عطا کرتا ہے۔اس سے زندگی کو مبسوط انداز میں دیکھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔وہ دانش اور جذبوں کا حقیقی امتزاج عطا کرتا ہے۔اقبال نے فلسفۂ عجم پر مقالہ پیش کر کے جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کی ۔یہہ کام انھوں نے پہلے ہی برطانیہ کی یونیورسٹی میں انجام دیا تھا۔سعید اختر درّانی کی بازیافت سے اس کا پتہ چلتا ہے تاہم اس وقت کے حالات اور تحقیقی کام' سہولتوں اور صداقتوں کے لئے جرمن یونیورسٹی ناگزیر تھی۔ایلیٹ بھی فلسفے کے طالب علم رہے۔انھوں نے اس وقت کے ایک اہم فلسفی بریڈلے پر اپنا مقابلہ مکمل کیا۔یورپ کے لئے امریکہ سے ترک وطن کرنے کے بعد جنگ کے حالات نے انہیں دوبارہ امریکہ جانے کی اجازت نہ دی جس کی وجہ سے وہ ڈگری کی تکمیل نہ کر سکے۔دونوں کی شاعریؒ میں فلسفیانہ خیالات کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ان کی شاعری میں دانشورانہ روایات کا گہرا حصہ ہے۔عموماً فلسفہ اور دانشوری کو شاعری کے لئے نقصان دہ تصور کیا جاتا ہے۔یہہ بات اس حد تک اہمیت رکھتی ہے کہ خالص فکر کو جذبوں کی آنچ میں پگھلائے بغیر خام انداز میں شعر کے سانچے میں ڈھالا جائے۔مگر دانش اور جذبوں کا حقیقی امتزاج شاعری کو رفعت عطا کرتا ہے۔

ٹی۔ایس۔ایلیٹ کا بیسویں صدی کے عظیم شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ ٹائم میگزین کا بیسویں صدی کے اختتام پر مختلف آرا پر مشتمل یہہ اعلان بھی سامنے آیا کہ وہ اس صدی کے سب سے عظیم شاعر ہیں۔مجموعی حیثیت سے شعر و فن کے حلقوں کا وسیع تر سطح

پر اتفاق بھی رہا۔ تاہم بعض حلقوں کا یہ احساس تھا کہ ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس W. B. Yeats بھی اس کے مستحق تھے۔ سچ تو یہہ ہے کہ ایلیٹ نے شعری اظہار میں غیر معمولی تبدیلی کا ثبوت دیا ہے۔ شاعری کی تاریخ میں یہہ اہم موڑ ہے اگر چیکہ ان کی شاعری کا سرمایہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ غالب کی طرح ان کا شعری سرمایہ بھی محدود ہے۔ لیکن ان دونوں شاعروں کے ہاں غیر معمولی انقلابی تبدیلیاں ملتی ہیں۔ ایزرا پاؤنڈ کے ہاں بھی اتنی وسعت اور جدّت تھی کہ وہ کینٹوز (cantos) کے ذریعہ بنیادی تبدیلی فراہم کرتے ہیں۔ ایلیٹ نے انہیں اپنا Mentor کہا ہے۔ تخلیقی توانائی کی بھر پور توانا لہر پاؤنڈ کے ہاں نسبتاً کم ہے لیکن وہ غیر معمولی Craftsman تھے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے خرابہ (The Waste Land) کو انہوں نے نیا روپ دیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد سے فارم یا تکنیک کی اہمیت زیادہ بڑھ گئی۔ شاعری میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ایک نیا رنگ و آہنگ لے کر ابھرتے ہیں۔ ایلیٹ رومانیت کے سخت دشمن بن کر سامنے آئے۔ ایک طرف انہوں نے کلاسیکیت کو اور دوسری طرف مابعد الطبیعیاتی شاعری کو سراہا۔ ایلیٹ کا اثر تمام دنیا کی شاعری اور تنقید پر رہا۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی اردو میں آزاد نظم پر ان کا اثر گہرا ہے' (نئی تنقید' ص 338)

اقبال نے یورپ میں اپنے تعلیمی سفر کے دوران وہاں کی علمی و تہذیبی فضا سے نہ صرف اکتساب کیا بلکہ اس کی خامیوں کا بھی بہت گیرائی اور گہرائی سے جائزہ لیا۔ ان کی

شاعری نے جہاں مغرب کی بے ہنگم زندگی پر تنقید کی ہے، وہاں اس کی فعالیت کو مشرق کے لئے ناگزیر قرار دیا۔ اقبال کو مغربی دنیا دیکھنے کے وسیع تر مواقع حاصل ہوئے۔ ایلیٹ مشرقی دنیا کی عملی زندگی کے تجربوں سے دور رہے، تاہم مشرقی فکر، خاص طور پر بدھ ازم اور اپنیشد کے گہرے اثرات ان کے شعری شعور کا حصہ بن گئے۔ ہندوستانی فکر، ایلیٹ اور اقبال کی شاعری کا اہم عنصر ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں خاص طور سے اور عمومی حیثیت سے دوسرے دور میں، ہندوستانی فکر اور یہاں کے روحانی سرچشموں کو بنیادی اہمیت دی۔ دونوں شعرا کے ہاں مشرق اور مغرب کا حسین سنگم ملتا ہے اور مغرب کی مادیت پرستی پر شدید تنقید ہے۔ دونوں کی تنقید میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اقبال کا لہجہ جارحانہ ہے جب کہ ایلیٹ نے علامتی انداز میں شعری ارتکاز کے ساتھ اپنے رویہ میں توازن رکھا۔ جارحانہ رویہ کی معقول وجہ تھی۔ ایک حریت پسند مفکر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے مغربی استعماریت کو تنقید کا نشانہ بنایا اور ایک نئے مشرق کی وکالت کی جب کہ ایلیٹ نے ایک نئے مغربی شعور کی ضرورت پر زور دیا جس میں مشرقی فکر بھی شامل ہے۔ یہاں یہہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ایلیٹ کی شاعری کا آغاز عمر خیام کی رباعیات کے Mystification کا نتیجہ ہے۔ اس طرح اقبال اور ایلیٹ دونوں کے ہاں مجموعی حیثیت سے مشرق اور مغرب کے صحت مند عناصر کا امتزاج ملتا ہے۔

اقبال نے شعری اظہار کے لئے اردو اور فارسی زبانوں کے سرچشموں سے گہرا

اور وسیع تر اکتساب کیا۔ اسی طرح ایلیٹ نے انگریزی اور فرانسیسی شاعری میں مافی الضمیر کا اظہار کیا اگر چیکہ فرانسیسی شاعری کی کوششیں بالکل ابتدائی نوعیت کی ہیں جب کہ اقبال کا بڑا حصہ فارسی میں ملتا ہے۔

شاعرِ مشرق کی ابتدائی شاعری پر رومانیت کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ ایلیٹ نے جدید شاعری کو عالمی سطح پر فروغ دینے میں غیر معمولی اہم رول ادا کیا ہے مگر Formative stage میں رومانیت کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تنقید نگار فرینک کرموڈ نے جدیدیت کے قافلہ میں اہم نقیب ہیوم ' پاؤنڈ اور ایلیٹ میں رومانی اثرات کا تجزیہ کیا ہے۔

ایلیٹ کی ابتدائی شاعری میں تشکیک حاوی رہی۔ یہ تشکیک بھی دراصل تلاش اور جستجو کا دوسرا نام ہے۔ بادلیر کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ انکار کے مرحلوں کے بعد جو شخصیت جنم لیتی ہے وہ مستند ہوتی ہے۔ ہمیں اقبال کی شاعری میں جستجو کا عنصر نمایاں ملتا ہے۔ انھوں نے Stray Reflections میں یہ انکشاف کیا ہے کہ ورڈس ورتھ نے ان کو دہریت سے بچالیا۔ وہ تشکیک کے مرحلے سے گزرے ہیں۔

اقبال اور ایلیٹ کی شاعری کے تجزیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اپنے شعری سرمائے میں قدامت پسندی اور کٹر پن سے انحراف کرتے ہوئے آفاقی قدروں کو اپنایا۔ مگر یہ عجیب امتزاج ہے کہ دونوں کی نثری تحریروں میں عیسائی اور اسلامی

میتھالوجی (Islamic Mythology) کی پرزور وکالت ملتی ہے۔ ایلیٹ نے اپنی شاعری میں Humility کو حکمت قرار دیا۔ ان کی شاعری اس کی واضح مثال ہے مگر ان کی نثری تحریروں کا ایک دور دانشورانہ جارحیت (Intellectual arrogance) کا نمونہ پیش کرتا ہے۔

ایلیٹ اور اقبال دونوں نے فرد اور سماج کے لئے روحانی ذرائع سے انقلاب کی تمنا کی۔ ایلیٹ کا خاندان (Unitarianism) کا قائل تھا جس میں عیسائی عقیدہ تثلیث کو تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ ابتدائی زندگی میں وہ اس سے مربوط رہے تاہم بعد میں انھوں نے Anglo-Catholic مسلک قبول کرلیا۔ اس کے بعد ان کی شاعری روحانی سرچشموں سے مربوط ہوگئی جب کہ ابتدائی شاعری میں Myth اور علمِ انسانیات (Anthropology) کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ اقبال کی ابتدائی شاعری میں حُب الوطنی کے نغمے، فطرت کے شاداب گیت ملیں گے۔ اس کے بعد مذہبی حسیّت (Religious Sensibility) کا واضح موڑ ملتا ہے۔ اس طرح دونوں شاعروں کے شعری سفر میں ہمیں قدرے یکسانیت ملتی ہے۔

بیسویں صدی کی دو اہم شخصیتوں نے بے شمار اثرات قبول کیے مگر اپنی اُپج (Originality) اور منفرد مزاج کو برقرار رکھا۔ انھوں نے انہی عناصر کو اپنی فکر میں شامل کیا جو ان کے بنیادی فکری ڈھانچے سے متصادم نہیں رہے۔ ایلیٹ کے ہاں

علمِ انسانیات(Anthropology) 'فرانسیسی شاعری' کلاسیکی شعرا مابعدالطبیعیاتی شعرا اور جدید مفکرین کے خیالات کے علاوہ عیسائی فکر کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ اس طرح اقبال نے مشرق اور مغرب کے ادب سے اکتساب کیا۔ جدید مفکرین کے علمی نتائج کو اپنی فکر کا حصہ بنایا۔ اسلامی ورثہ کو اپنی فکر کی اساس بنا کر ایک روشن خیال دانشور کی طرح انھوں نے مذہب کی تعبیر و تشریح کی ۔ ان کی غیر معمولی اہم انگریزی کتاب ' Reconsturction of Religious Thought in Islam' جو سات لکچرس پر مشتمل ہے' اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے۔ انھوں نے اجتہاد کی اہمیت کا احساس عطا کیا ۔ اس روشن خیالی کے برخلاف' ایلیٹ مذہبی نقطہ نظر عیسائی قدامت پسندی کے ترجمان نظر آتے ہیں۔

عشق کو دونوں کی شاعری میں مرکزی مقام حاصل ہے ۔ اقبال نے عشق کو کائنات کی تفہیم اور انسانی ارتقا کے لئے ناگزیر قرار دیا۔ ایلیٹ نے عیسائی فکر میں عشق کی بنیادی اہمیت کی طرف توجہ مبذول کی۔ دونوں نے عشق کو اپنی شاعری میں اس طرح سمویا کہ وہ آرٹ کا انوٹ حصہ بن جاتا ہے تاہم عشق اور عقل کے درمیان کشاکش ایک اہم موضوع کی حیثیت سے اقبال کی شاعری کے بڑے حصے پر محیط ہے۔

دونوں شخصیتوں نے کلچر کو اپنی شاعری اور نثری تحریروں کا مرکزی موضوع بنایا ہے۔ مذہب اور کلچر دو وسیع تر اصطلاحیں ہیں۔ ان کی جہتیں متعین کرنے میں ابھی ہمیں

خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ اسی لئے بعض کلچر کو وسیع تر اصطلاح تصور کرتے ہیں تو بعض مذہب کو۔ دونوں کے ہاں کلچر پر بہت زور دیا گیا ہے۔ مگر ان کے تصورات بھی مذہبی فکر کے وسیع تر ڈھانچے سے متصادم نہیں ہوتے۔ پچھلی صدی کے اہم ماہر سماجیات ساروکن (Sorokin) نے کلچر کو انسانی سماج کے پس منظر میں Ideational اور sensate کے خانوں میں تقسیم کیا۔ Sensate کلچر مادیت سے مربوط ہے جب کہ Ideational کلچر نظریاتی سطح پر مادیت کا شکار نہیں۔ ایلیٹ اور اقبال دونوں نے موجودہ معاشرہ کو Sensate Culture کا ترجمان بتاتے ہوئے اس پر شدید تنقید کی۔

دونوں کی شاعری میں (Mysticism) کو بڑی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تاہم عیسائی اور اسلامی فریم ورک میں ان رجحانات کا ظہور ملے گا۔ اقبال نے تصوف سے گہری وابستگی کا ثبوت دیا۔ تاہم وہ خانقاہیں ' جو از کار رفتہ ہوگئی ہیں اور تصوف کے وہ ادارے' جو فعال درس زندگی دینے کے بجائے مجہول راستوں کی نشاندہی ہی کرتے رہے ہیں' حکیم الامت کی سخت تنقیدوں کا نشانہ بنے۔

تصورِ وقت کو دونوں کی شاعری میں اہم مقام ہے۔ ایلیٹ نے اپنی شاعری کی ساخت میں وقت کو برتا ہے۔ اقبال نے اپنی نثری تحریروں اور شعری سانچوں میں وقت کی اہمیت دلائی ہے۔ فارسی اور اردو شاعری میں بے شمار اشعار اس کی اہمیت کو روشناس

کرواتے ہیں۔

دونوں شخصیتوں کے پاس گہرا تاریخی شعور ملتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا ''میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو'' لیکن یہ جستجو کسی تاریخی لمحے میں دوبارہ واپس لوٹنے کی نہیں تھی بلکہ وقت کے اس دھارے سے اپنا رشتہ قائم رکھ کر نئے جہاں کی تخلیقی آرزو تھی۔ اس لئے اقبال احیا پسند نہیں کہلائے جا سکتے۔ انھوں نے تجربہ اور آنے والے کل کو نظر انداز نہیں کیا۔ وہ شاعرِ فردا تھے۔ جوانوں کو پیروں کا استاد دیکھنا چاہتے تھے۔ ایلیٹ کی شاعری میں تاریخ اور تجربہ کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ایلیٹ نے جدیدیت کے فروغ میں نمایاں رول انجام دیا۔ لیکن انھوں نے ماضی کی ماضیت پر جو حال سے مربوط رہے کافی زور دیا ہے۔ ان کی نثری تحریروں' خاص طور سے عیسائی نقطہ نظر کی ترجمان نگارشات میں وہ خوبصورت توازن کم کم ہی نظر آتا ہے۔ ایلیٹ کی شاعری میں جس انسان کی تلاش ہے' وہ کلچر' مذہبی فلسفہ اور شعری تجربوں میں ملے گا ۔ اس میں وجودی تشویش (Existential anguish) ہے۔ یہ تشویش اقبال اور غالب کے شعری سرمایہ کا حصہ ہے۔ اگر چیکہ خالصتاً وجودی مفکرین کی حیثیت سے ان کی شناخت مشکل ہے۔ بیسویں صدی میں وجودی فکر نے ذہنی زندگی اور اندازِ فکر کو متاثر کیا ہے مگر وجودیت ایک تحریک سا روپ اختیار کرنے سے پہلے بھی فنکاروں کے ہاں کسی نہ کسی سطح پر موجود تھی۔ دونوں کے درمیان جمہوریت' مارکسزم' فسطائیت' صیہونیت' انسان اور سماج کے رشتوں'

انفرادی انا' اجتماعی انا کے امور پر قدرے اختلاف کے باوجود مشترک انداز فکر ملتا ہے۔
ایلیٹ نے اپنی فکر اور شاعری کے ذریعہ مغربی اور مشرقی ادب پر گہرے' اثرات مرتب کیے ہیں۔ ہندوستانی ادب' فارسی ادب' عربی ادب اور روسی شاعری پر بھی ان کے اثرات کا پتہ ملتا ہے۔

ایلیٹ کو ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں 1948 میں نوبل انعام دیا گیا جس کے وہ یقیناً مستحق تھے۔ تاہم نوبل کمیٹی کے طریق کار' سلکشن کمیٹی کے انداز' مشرقی ادب سے کم واقفیت نے شاعر مشرق کو نظر انداز کیا۔ اقبال کو توقع تھی کہ جاوید نامہ پر جو ان کی شاعری اور فکری ارتقا کی اہم کڑی ہے' نوبل انعام مل جائے گا مگر وہ حالات' جس کا میں نے ذکر کیا شاید مزاحم رہے۔

ہم نے ایلیٹ اور اقبال کے نقطہ نظر کا تقابلی جائزہ لیا۔ آیئے ان دونوں کی شعری کائنات (Poetic Universe) کی کچھ دیر کیلئے سیر کریں تا کہ تخلیق کا سحر خود محسوس کریں۔ دونوں شاعروں کی اپنی اپنی تخلیقی دنیا کی انفرادیت اور مشترک قدروں کا مشاہدہ کریں۔

اقبال نے مغربی تہذیب پر تنقید کرتے ہوئے کہا۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

ایلیٹ نے یورپی تہذیب کو نظم ''Gerontion'' میں ٹوٹے ہوئے شیرازہ کے پس منظر میں ایک بوڑھے سے تعبیر کیا ہے۔

Here I am, an old man in a dry month,

Being read to by a boy, waiting for the rain.

ویسٹ لینڈ (خرابہ) میں ہمارے عہد کی المناک داستان سنائی دیتی ہے جو ٹوٹے ہوئے پیکروں کا ڈھیر ہے۔

اقبال نے زمانہ اور تقدیر سے متعلق اپنے نقطۂ نظر کا یوں اظہار کیا ہے۔:

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے؟

(Chorus) میں ایلیٹ نے جبر اور وقت سے متعلق اس طرح شعری پیرایہ اپنایا ہے۔

Then came, at a predetermined moment,in time

and of time.

فورکوارٹیٹس (Four Quartets)' ایلیٹ کی شہرہ آفاق نظم ہے جو وقت کے محور پر

گھومتی ہے:

Time Present and Time Past.

Are both perphaps present in time future,

And time future contained in time past

If all time is eternally present

All time is undreemable.

اقبال نے وقت کو اپنی شاعری میں برتا ہے۔ وہ وقت کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں

سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات

سلسلہ روز و شب اصل حیات و ممات

عشق، ایلیٹ اور اقبال کی شاعری میں بنیادی محرک ہے۔ ایلیٹ نے شعر کی وساطت سے کہا ہے:

Love is the unfamiliar name

Behind the hands that wore

The tolerable shirt of flame

Which human power cannot remove

اقبال نے عشق و عقل کی کشمکش میں، عقل پر عشق کی برتری کا احساس دلایا ہے۔

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے' صحرا بھی' جرس بھی ہے' کارواں بھی' راہبر بھی ہے' اور رہزن بھی۔:

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات ' عشق سے نارِ حیات

صدقِ خلیل بھی ہے عشق' صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ ' عقل تمام بو لہب

بڑا شاعر' موت اور زندگی کے مسائل پر غور کرتا رہتا ہے۔ ایلیٹ نے موت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

Those who sharpen the tooth of dog, meaning

Death

Those who glitter with the glory of the humming bird,

meaning Death.

Those who sit in the stye of contentment, meaning

Death

Those who suffer the ecstacy of the animals, meaning

Death

اقبال نے زندگی اور موت پر بے شمار اشعار اور نظموں کا ذخیرہ چھوڑا ہے

موت تجدیدِ مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

ایلیٹ کے ہاں رومانی حسیت سے زیادہ جدید حسیت کی کارفرمائی ہے۔ انھوں نے اظہار کو نئی وسعت بخشی ہے۔

Let us got then,you and I,

When the evening is spread out against the sky

Like a patient ehterised upon a table ;

شام کو جس انداز میں یہاں پیش کیا گیا ہے وہ رومانی انداز فکر سے مختلف ہے۔ان سطروں میں شاعر نے نئے معانی پہنائے ہیں۔اس کے برخلاف شاعرِ مشرق اقبال بنیادی طور پر (Utopian)اور نصب العینی شاعر تھے۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں

جب دکھاتی ہے سحر عارضِ رنگین اپنا
کھول دیتی ہے کلی سینۂ زرّیں اپنا

جلوہ آشام ہے یہ صبح کے میخانے میں
زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں

خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا

سماجی' تہذیبی' ادبی نقطہ نظر سے اقبال کی معنویت ہمارے لئے زیادہ ہے۔

ترانۂ ہندی وہ نغمہ ہے جو ہمارے قومی مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔ یہ ترانہ لحمہ لحمہ ہندوستان کی فضاؤں میں گونجتا رہا ہے۔ بلکہ خلاؤں میں بھی اس کی آواز پھیلی۔ ستاروں کی رہ گذر پر یہ نغمہ گونجا۔

اقبال اور ایلیٹ کے ہاں انسان کی تصویر قدرے مختلف ہے۔ ایلیٹ کی ابتدائی شاعری میں قنوطیت کا رجحان زیادہ نمایاں ہے۔ شاعر نے انسان کا جو تصور (The Hollow Men) ''کھوکھلے انسان'' میں پیش کیا ہے وہ عصر حاضر کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔

اقبال نے عصرِ حاضر کے اس کرب کو نئے مثبت معنوں میں اس کے امکانات میں ڈھونڈا۔ وہ انسان کو تخلیق میں خدا کا شریک اور اس کا فعال نائب قرار دیتے ہیں۔ ان کے شعروں میں انسان کی تصویر اس طرح جھلکتی ہے:

اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم
یہ ذرہ نہیں، شاید سمٹا ہوا صحرا ہے

عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیابان، کہسار و زاغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے
انسان کو راز جو بنایا

بیتاب ہے ذوق آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا

اقبال اور ایلیٹ کی دانشوری اور شاعری کے ذریعہ انسانی فکر کے ارتقا میں جو عطا ہے وہ معنی خیز ہے۔ یہ دو معاصرین ہمارے شعور اور ادبی و تہذیبی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن گئے۔

اقبال کا تصورِ انسان

جنگل کے معاشرے سے متمدن سلطنتوں اور تہذیبوں کے قیام تک انسان کا تصور بدلتا رہا ہے۔ آ گہی کی نئی راہیں کھلتی رہی ہیں۔صدیوں پر محیط تاریخ کی رہ گزر پر اس کے تخلیقی سفر نے خود آ گہی کی نئی شمعیں فروزاں کیں۔جنگل کا گھٹا ٹوپ اندھیرا' ہلکے ہلکے چھٹنے لگا۔تہذیبوں کا عروج و زوال ہوا۔مذہب نے صبح ازل سے انسان کے شعور کی رہنمائی کی۔فطرت کے دامن میں ہزاروں سوالات اور اسرار کے پردوں سے خود آ گہی کے نئے جلوے نظر آنے لگے۔لیکن مذہب کی غیر لچکدار تشریحات کے درمیان وہ رسومات کی زنجیروں میں بھی جکڑا رہا۔انسانی وجود کی تفہیم میں مذہبی مفکرین' فلسفیوں' رشیوں اور ماہرین نفسیات نے فطرت اور نظریات کے آئینوں میں نئی روپ پیش کئے۔فطرت کے دامن میں خوف اور امید نے کئی صنم ترشوائے اور یہ صنم کدہ' ایک طلسمی دنیا کے مختلف اشکال میں سر اُبھارنے لگا۔افریقہ کے جنگلوں سے عہد جدید کی فلک بوس عمارتوں تک انسان کا مطالعہ نئے نئے زاویوں سے ہوتا رہا۔بظاہر مشرق اور مغرب کے درمیان ان زاویوں کے جھکاؤ میں فرق اور فصل نظر آتا ہے۔

ماہرِ اقبالیات اور تخلیقی فکر کے حامل فلسفی عالم خوندمیری کے خیال میں یہ فصل اس وقت زیادہ واضح ہو جاتا ہے جب ہم مثال کے طور پر مغرب سے افلاطون (Plato) اور مشرق سے مہاتما گوتم بدھ، لاؤ تزے۔ (Laotze) اور ابتدائی ویدانت کے تصورات کا تقابلی جائزہ لیں۔

جہاں تک بیسویں صدی کا تعلق ہے اس دور میں بے شمار بہیمانہ جنگوں، اور استعماریت کے شکنجوں کے باوجود انسان دوستی کی مشعلوں سے روشن رہی ہے۔ سماجیاتی نقطہ نظر سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ خدا کے تصورات جو ہزاروں سالوں میں، اپنے بنیادی عرفان کے ساتھ روپ بدلتے رہے اور عصرِ جدید میں بہت حد تک شعور کی سطح پر اپنے معنی کھوئے بغیر، انسان کی خود اختیاری (Autonomy) کے خواب کو اہمیت دینے لگے۔ اکیسویں صدی اور مابعد جدید دور کا انسان اپنے دور میں بیسویں صدی کی روشن سوغاتیں اور بھیانک تاریکیوں کو لیے محوِ سفر ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے انسان کو آزادی دی گئی ہے۔ اس کو اس دھرتی پر خلیفہ کی عظیم الشان ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں۔ وہ ایک ٹرسٹی، امانت دار ہے (سورہ 72-33) اور خلیفہ کی ذمہ داریاں قبول کرنے کی وجہ سے اس دنیا کی تشکیل میں مذہبی شعور کی روشنی میں شریک کار ہے۔

مختلف مذہبی مفکرین نے اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے کہ قرآن

کا بنیادی موضوع انسان ہے۔اس کی تخلیق خدا کے ہاتھوں انجام پائی۔(سورہ 75-38)
وہ ایک مخفی خزانہ تھا جو ظاہر ہوا۔اس کی دسترس میں یہ کائنات کے خزانے دیئے گئے۔اس
کے جوہروں کو نمایاں کرنے کے لئے یہہ دنیا ایک اسٹیج بن گئی۔

اسلامی دنیا اور تاریخ کے عظیم شاعر اور نقیب مفکر رومی نے انسان کی بے پناہ
صلاحیتوں کا ذکر کیا ہے(مثنوی 43-3138)تخلیقی فکر کے نقیب ابن عربی نے انسان کی
بنیادی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انسان کی مرکزی حیثیت' خدا اور اس کی تخلیق
کے درمیان فصل کو کم کرتی ہے۔غالب کی شعری کائنات میں آرزو کا استعارہ' اور سفر کے
محرکات' تخلیقی انسان کی ازلی تلاش کی علامتیں ہیں۔

علامہ اقبال نے انسان کا ایک فعال تصور پیش کیا: مردِ حر' موت میں بھی زندگی
کی حرارت محسوس کرتا ہے۔

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

شاعرِ مشرق کے تصورِ انسان میں مردِ مومن کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔اس
سے انسان کی حقیقی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔وہ Divine laws کا نفاذ کرتا ہے جب کہ
نباتات و جمادات تقدیر کے پابند ہوتے ہیں۔انسان (Determination) جبر اور

(Free Will) قدر کے درمیان تناؤ کی فضا میں رہتا ہے۔ وہ خیر وشر کے معرکہ میں سرگرم عمل ہے۔ اس کا وجود جامد نہیں۔ ''ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان' نئی آن''۔ وہ فکر وعمل میں الٰہی قانون اور حقیقت کا ترجمانِ بن جاتا ہے۔ ترجمانِ حقیقت نے خطبات میں تفصیل سے انسان' خدا اور کائنات کے روابط پر روشنی ڈالی ہے۔

مشرق اور مغرب میں انسان کے تصورات کے درمیان فرق کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ یوں تو Human identity ہی بنیاد ہے لیکن صدیوں کے جغرافیائی' تہذیبی اور فکری عوامل سے تبدیلیوں کا عمل بھی ایک زندہ حقیقت ہے۔ مشرق' وجدان Intuition پر زیادہ انحصار کرتا ہے جب کہ مغرب میں عقلیت Rationality کو اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ مشرق میں فعالیت Dynamism کا فقدان نظر آتا ہے جب کہ مغرب کی فعالیت ایک کھلی حقیقت ہے۔ مشرق میں تصوف کے اثرات ملتے ہیں۔ مغرب میں سماجی قدریں ترجیحات کے پہلے زینے پر ہیں۔ اس کے علاوہ مادیت اور روحانیت کے تصورات کا فیصلہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے۔

زندگی اور کائنات کے تصورات انسانی شعور کی سطح پر واضح بھی ہیں اور پُر اسرار انداز میں مربوط بھی۔ مختلف مفکروں نے اپنے تجربوں اور perception کی روشنی میں انسان کو پرکھا۔ افلاطون کی فکر میں Disillusionment ملتا ہے۔ ڈیکارٹ کہتا ہے یہ دنیا کوئی illusion نہیں ہے: "I think, therefor, I am" علامہ اقبال

کی فلسفیانہ سوالات پر مشتمل کتاب "گلشن رازِ جدید" میں اندرون کی آواز مختلف روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ مغربی فکر میں ڈانٹے نے انسان کے واسطے سے سچائی کی تلاش کی۔ کانٹ نے Human will کو اپنی فکر کا موضوع بنایا۔ گوئٹے نے انسان کے اندر امکانات کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ آج کی دنیا میں انسان کو بنیادی موقف حاصل ہوگیا ہے "The proper study of mankind is man" انسان صرف Psychosocial studies ہی کا موضوع نہیں ہے۔ افلاطون کے 'Deceptive man' ارسطو کے "Man of decision" سے اکیسویں صدی تک انسان اس کائنات کا مرکز تصور کیا جاتا رہا ہے۔

انسان کی فطرت کو متعین کرنے کے لئے معاشی پس منظر اور Historical dialectics میں تجزیے کئے گئے۔ سائنس دانوں میں جولین ہکسلے (Julian Huxley) اور دوسروں نے سائنسی قدروں اور ارتقا میں تلاش کیا۔ لیمونٹ نے مادیت میں تلاش کیا جب کہ کیر کے گارڈ (kierkegaard) نے انسان کو عیسائی وجودیت Christian Existentialism اور سارتر نے دہریت پرمبنی وجودیت کے پیمانوں سے جانچنے کی کوشش کی۔ فرائیڈ نے جنس اور اس کی کج رویوں میں انسان کو تلاشنا چاہا۔ ان مفکرین کے برخلاف اقبال کا مردِ مومن اسلامی پس منظر سے ابھرتا ہے۔ اقبال نے عیسائی تصور اور اسلامی فکر کے درمیان بھی فرق کو واضح کیا:

The Quran omits the serpent and the rib stories

حکیم الامت نے اس حوالے میں قرآن اور انجیل کے تصورات کو وضاحت سے پیش کیا ہے۔ ان کے بعض تصورات خطبات میں غیر معمولی انقلابی نقطہ نظر کے حامل ہیں۔ یہ روایات سے یکسر مختلف ہیں جیسے کہ ان کا تصورِ جنت ہے جو ایک نئے فکری نقطہ نظر کا ترجمان ہے۔

انسان پیکرِ خاکی ہے لیکن وہ افلاک سے برسرِ پیکار ہے اور اس عمل میں وہ اپنی خودی اور Absolute self کے درمیان فصل کو پاٹتا ہے۔ وہ کائنات میں تخلیق کے دوسرے روپ رنگ کی طرح صرف تماشائی نہیں ہے۔ ذوقِ پرواز سے اسرار کے پردے ہٹاتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں خودی کو مرکزی مقام حاصل ہے۔

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے؟ بیداریِ کائنات

شاعرِ مشرق نے انسان کی انفرادیت کو غیر معمولی اہمیت دی ہے لیکن وہ ذوقِ بندگی کو انسان کے وجود کا اٹوٹ حصہ سمجھتے ہیں۔

انسان نے اس زمین پہ خلیفہ ہونے سے اتفاق کیا جب کہ کائنات کی دوسری

مخلوقات نے اس ذمہ داری کو اٹھانے سے گریز کیا۔ اس پس منظر میں یہ کہا جاتا ہے کہ جہاں انسان خدا کا متلاشی ہے وہاں خدا بھی انسان کی تلاش میں ہے۔اقبال کی نظم ''روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے'' انسان کی اہمیت اور امکانات پر روشنی ڈالتی ہے۔ ''احسن الخالقین'' کی روشنی میں انسان تخلیق میں شریکِ کار ہے۔

توشب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیسویں صدی کے عظیم ناول نگار' A Passage to India کے خالق ای۔ایم۔فاسٹر کا خیال ہے کہ ان سطروں میں بغاوت کے جذبات کا گماں ہوتا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ خدا کی دی ہوئی توانائیوں کے نتیجے میں انسان خلیفۃ اللہ فی الارض کی حیثیت سے جو کام انجام دیتا رہا ہے اس کی تفسیر ہے۔اسلام نے عمل پر زور دیا ہے دراصل عمل کی تقدیر ہوتی ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے' جنت بھی' جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

انسان کو تخلیقی صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ میکانکی تکرار کا نام زندگی نہیں۔ انسان کی خواہش' آرزوئیں' شعور و بیداری اور جستجو اس کو ہر لمحہ' نئے امکانات کی تلاش پر مجبور کرتے ہیں۔ قرآن نے تدبیر کرنے' غور کرنے اور اس دھرتی پر سیر کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ

انسان کا خاص وصف ہے کہ وہ نئے جہانوں کی سیر سے ذہن ودل کے افق کو وسیع تر کرسکتا ہے۔

فلسفیِ اقبال، روح اور مادہ کی دوئی کے قائل نہیں ہیں۔ وہ انسانی تقدیر کے لیے انفرادیت پر زور دیتے ہیں۔ یہہ کائنات فروغ آدم کے بغیر معنی سے بھرپور نہیں ہے۔ دنیا ایک بند باب نہیں۔ End of history کا تصور تہذیبوں کے تصادم کے نظریہ کی طرح حقیقی نہیں۔ ہر لمحہ نئی تشکیل کی آواز سنائی دیتی ہے۔

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شائد
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

قرآن نے قوموں کے عروج وزوال پر غور کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ لایعنیت کی تعلیم نہیں دیتا۔ یہ کائنات معنی سے بھرپور ہے۔ اس میں ربوبیت کے مظاہر واضح ہیں۔

جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا کہ خودی کو اقبال کے تصورات میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ اس تصور کی اساس اسلامی ہے۔ تاہم مشرق اور مغرب کے ان تصورات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو شخصیت کی تعمیر کے سلسلے میں ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ انسانی شخصیت ایک مستقل flux ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی کے باوجود آج بھی اس دھرتی کا شاہکار Myopic vision کا شکار ہے۔:

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا

زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اقبال کا فلسفۂ عمل اپنے تخیل کی معرا ہے جب وہ کہتے ہیں کہ وہ جنت بھی قبول نہیں جو بخشی گئی ہو۔ یہ بات انہوں نے اپنے شاعرانہ تخیل کی بساط پر کہی ہے:۔

جنت تری پنہاں ہے تیرے خونِ جگر میں

''مطالعہ اقبال کے نئے گوشے'' میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے عبدالرحمٰن بجنوری کے اس فقرے' کا ذکر کرتے ہوئے تنقید کی ہے جس میں انھوں نے وید مقدس اور دیوان غالب کو ہندوستان کی دو الہامی کتابیں قرار دیا۔ جالبی کہتے ہیں بجنوری وید مقدس کا ذکر کرتے ہوئے نغمۂ خداوندی گیتا کو بھول گئے جسے ہندوستان کے اہل معرفت نے پانچواں وید کہا ہے اور جو ہندوستان کی تہذیب میں حرکت عمل کی اتنی بڑی دستاویز ہے کہ ادبیات عالم میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے وہ اقبال کو بھی نظر انداز نہ کرتے۔ اس اقبال کو جو برصغیر کی سرزمین پر گیتا کے بعد فلسفہ عمل کا سب سے بڑا مبلغ اور شارح تھا'' (نئی تنقید' ص 243)

جمیل جالبی مزید کہتے ہیں۔ اقبال کا کلام ایک ''وسیع تر کائنات کا نغمۂ تخلیق'' ہے

اس دھرتی کو بدلنے میں انسان کی بے پناہ کوششوں کا دخل ہے لیکن ستارے' سورج' چاند' اور فطرت کی بے شمار قوتیں' خاموش تماشائی ہیں۔

ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی ' تارے بھی تماشائی

خودی کے ذریعۂ انسان کائنات کو مسخر کرتا ہے۔قدرت نے انسان کو بے پناہ صلاحیتیں بخشی ہیں۔:

خودی کا رازداں ہو جا
خدا کا ترجماں ہو جا

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے
آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

خودی کی خلوتوں میں مصطفائی
خودی کی جلوتوں میں کبریائی

روشن خیال دانشور اور اردو کی ایک عظیم شخصیت ڈاکٹر عابد حسین کے خیال میں خودی ایک بہت بڑی طاقت ہے۔تاہم اگر اس پر کسی طرح کا کنٹرول ہی نہ ہو تو ابلیس کی طرح یہ خودی بے مہار ہو جاتی ہے۔

اقبال کے خیال میں اطاعت ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی سے خودی کی تربیت ہوتی ہے۔

خودی کی تربیت سے انسان کے اندر تخریبی قوتوں پر تحدید رہتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مردِ مومن کی امیدیں قلیل ہوتی ہیں۔ دلفریب ادا' نگاہِ دلنواز سے خوشگوار شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ شخصیت ژاں پاں سارتر کے تصور کی طرح آزاد رہنے کا شراپ نہیں بھوگتی۔ انسان آزاد رہنے پر اختیار رکھتا ہے۔ وہ سمندر کی چٹان پر ایک مجبور و بے بس شئے نہیں۔:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

جیسا کہ بیسویں صدی کے عظیم فلسفی برٹنڈ رسل نے کہا ہے کہ اصل مسرت فرد اور سماج کے درمیان ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ فرانسیسی فلسفی برگساں نے Creative Evolution میں تخلیقی توانائی پر زور دیا۔ لیکن یہہ سمت سے عاری تھی لیکن اقبال تاریخ کو خاص سمت کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

ایلیٹ کی طرح اقبال نے سری کرشن جی کو زبردست خراج پیش کیا ہے۔ ان کا تصورِ انسانیت غیر معمولی ہے اور Intellectual history of the will میں ان کی نمایاں اہمیت ہے۔ اقبال کے ہاں عمل پر بے پناہ اصرار تھا۔ اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے بدھ فلسفے میں بھی عمل کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ این میری شمل نے اس اندازِ فکر کو تنقیدی نظروں سے دیکھا ہے۔

کئی تنقید نگاروں کا خیال ہے کہ اقبال پر نیٹشے کے اثرات ہیں۔ انسانِ کامل کے تصور پر اس کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ اقبال نے اس بات کی تردید کی ہے۔ اس تردید کے باوجود تنقید نگاروں نے مختلف سطحوں پر نیٹشے کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ یہ تحقیق و تنقید کے بنیادی اصول سے متصادم نہیں۔ مصنف کی وضاحت پر Text کے جائزہ کو ترجیح حاصل رہے گی۔ مصنف کے بیان سے زیادہ متن کے مطالعہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اقبال نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ عبدالکریم الجیلی کے انسان کامل کا تصور جرمن مفکرین سے پہلے سامنے آیا۔ الجیلی نے انسان کامل کا تصور پیش کیا۔ الوہی اور انسانی صفات کے امتزاج کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ تاہم اقبال، الجیلی کا تنقیدی انداز میں جائزہ لیتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں فلسفہ اور مابعد الطبیعیات میں فرق نہیں ملتا۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ الجیلی کے دور میں تحقیقی اور تنقیدی اصولوں کی عصرِ حاضر کی شفافیت تلاش کرنا انصاف کا تقاضہ نہیں۔

مومن کی وہ ذات ہے جس میں آفاق گم رہتے ہیں۔ یوں تو لسانی سطح پر مومن سے مراد مسلمان ہے، مگر وسیع تر سطح پر Universal man ہے۔ اقبال کے فلسفیانہ تصورات کا محور مسلمان ہیں، مگر انسان دوستی کے حوالے سے دوسروں سے ان کا ربط نہیں ٹوٹتا۔ جاوید نامہ میں پوری انسانی تاریخ تلاش و جستجو کا مرکز ہے۔ اقبال کے تصورات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان دوستی کے جذبوں کو صرف سیاسی سطح پر مرکوز کرنا نہیں

چاہئے جیسا کہ مغربی دنیا کا خاص وطیرہ رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تصورِ انسانی کی اساس' اقبال کے نزدیک مذہبی ہے۔ اقبال پر غالب مذہبی رنگ پر نکتہ چینی کرنے والوں کو اس حقیقت کا واضح احساس ہونا چاہئیے کہ دنیا کے عظیم ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں بھی مذہبی شعور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ انسانی شناخت میں یہ شعور گوندھا ہوا ملتا ہے۔ اقبال کے ہاں ان تہذیبی تصورات کی کارفرمائی ملتی ہے جن سے ان کی زندگی کی صبحیں اور شامیں جڑی ہوئی تھیں۔ ہندوستانی فکشن کی ایک اہم شخصیت' ملک راج آنند کے خیال میں اقبال Prophet of a new concept of mankind ہیں۔ آنند کے خیال میں اقبال نے انسان کا ایسا نیا تصور دیا جو (Vitalist) ....(resilient).....اور(integral) ہے۔

اقبال کی فکر میں مذہب کی معنویت یہ ہے کہ وہ انسانی نجات کا ذریعہ ہے۔ ہندوستان کے عظیم فلسفی رادھا کرشنن نے اس حقیقت کا اظہار کیا۔ شاعرِ مشرق ایک وسیع اتحاد کے طالب ہیں۔ اس لئے وہ نیشنلزم کی اندھی تقلید کے مخالف ہیں۔ یہ رویہ حب الوطنی سے گریز کا سبق نہیں دیتا۔ اپنے اطراف واکناف کے ماحول کی چاہت ایک فطری جذبہ ہے۔ جگدیش چندر بوس کے تجربات نے ہمیں اس حقیقت کا عرفان بخشا کہ پودے بھی اپنے ماحول سے انسیت رکھتے ہیں۔ نیشنلزم صرف ایک سیاسی سطح پر اپنے آپ کو مقید کرتا ہے جب کہ حب الوطنی ایک فطری جذبہ ہے۔ لیکن اقبال کے اس اندازِ فکر سے بعض

اذہان میں تضادات اور تناقصات کا گمان ہوتا ہے۔ اقبال نے تصورِ پاکستان پیش کیا جو ایک علاقائی وفاداری کا طالب ہے۔ کیا اس طرح کا خیال امت کے وسیع تر تصور سے ہم آہنگ ہوسکتا ہے؟ کیا یہ مسلم نیشنلزم کے تصورات نہیں ہیں؟ کسی بھی مفکر کے سیاسی' تہذیبی افکار کے تصورات' غیر لچک دار نہیں رہ سکتے اگر اس کے ہاں تخلیقی جہت غالب ہو۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال نے پاکستان کے تصور کو کہیں اپنی شاعری میں پیش نہیں کیا۔ الہ آباد کے خطبہ میں جو تصور ابھرتا ہے وہ کئی Alternatives کو پیش کرتا ہے۔ ورنہ ان کی تخلیقی فکر سوالیہ نشان کی زد میں رہ جاتی۔ علاقائی وفاداری' سیاسی مصلحتوں کے اسیر ہونے کا بھی الزام لگ جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی تحریری شہادت بھی موجود ہے کہ وہ ایک مرحلے پر یقینی طور پر پاکستان کے موئید نہیں رہے۔ ایڈورڈ تھامسن کو لکھے گئے خطوط میں انھوں نے واضح انداز میں لکھا کہ میں پاکستان کا (protagonist) نہیں ہوں۔

کلامِ اقبال میں شعور کی بنیادی اہمیت ہے۔ اندرونی حقیقت پر زور ہے۔ وہ انسانی تاریخ کے نشیب و فراز کو ایک خاص انداز سے دیکھتے ہیں۔

The ultimate nature of reality is spiritual

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے

ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے

حکیم الامت نے تصوف کی روایات کے حوالے سے بھی انسان کو دیکھنے کی سعی کی۔ وہ شخصیت کی تحلیل یا فنا کے قائل نہیں اور اپنے آپ کو خواجہ اہل فراق کی صف میں کھڑا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ ذوقِ بندگی سے سرشار شخصیت مقام بندگی دے کر شان خداوندی لینا نہیں چاہتی۔

انسانی آزادی کی اقبال جس طرح وکالت کرتے ہیں اس سے وجودیت کے علمبرداروں کے ساتھ ان کی مماثلت نظر آتی ہے۔ وجودی نقطہ نظر، شخصیت کی اساس، آزادی، شناخت، شعور، موت کا احساس، تشویش اور ... Dread پر ہے۔ وجودی فلسفوں اور اقبال کے درمیان جہاں اشتراک ہے وہاں واضح فرق بھی نظر آئے گا۔ آزادی، اقبال کے تصورات کی بنیاد ہے۔ نیٹشے اور سارتر کے انسان کے تعلق سے تصورات سے کچھ مماثلت ضرور ملتی ہے۔ مارکسی فلسفہ کی روشنی میں انسان کو تاریخی عوامل اور ردِ عمل سے پرکھا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے آخری دہے میں اس فلسفہ کی نظریاتی موت کا اعلان ہوا۔

شاعرِ مشرق کی نظم ''لالہ صحرائی'' ان کی وجودی فکر سے عبارت ہے۔ اس اہم شعری تخلیق کے گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ اس کے فکری اثرات کا جائزہ بھی ضروری ہے:

یہ گنبدِ مینائی ' یہ عالمِ تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی

بھٹکا ہوا راہی میں ' بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلۂ سینائی ' میں شعلۂ سینائی

تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبۂ پیدائی اک لذتِ یکتائی

غواصِ محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریا میں ' دریا کی ہے گہرائی

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

کائناتی ڈرامہ میں بے شمار مرحلے آسماں کے اسٹیج پر نظر آتے ہیں۔ خدا' انسان اور ابلیس کو اقبال نے اپنے کلام میں Allegorical انداز میں پیش کیا ہے۔ ہم' ہیگل' رازی اور اقبال کے درمیان کچھ مماثلتیں اور فرق بھی محسوس کرتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں عقل و دل کی کشمکش نے بھی بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے شائد یہہ رومانی فکر کے اثرات تھے۔ مگر اقبال نے جس انداز سے اس کشمکش کو کہیں کہیں دو انتہاؤں پر رکھا ہے' وہ نہ صرف عجیب لگتا ہے بلکہ حقیقت سے بھی بعید ہے۔ کیا عقل اور دل' کسی موڑ پر ہم سفر نہیں؟ حقیقت کے ادراک میں اقبال کی نظمیں ''انسان'' اور'' ساقی نامہ'' گہرے تجزیے کی مستحق ہیں۔ انسان اپنی کلی تقدیر Absolute destiny اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب کہ انفس اور آفاق کے درمیان توازن ہو۔ تاریخ کے کینوس پر ہزاروں پرچھائیوں کا کولاژ ملتا ہے۔ میں نے اپنے پی ایچ ڈی کے غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ میں اقبال کی عطا پر روشنی ڈالی ہے: عہدِ جدید میں اقبال کی عطا غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔

The dynamics of history lies in this balance. In the Eastern Thought. Iqbal has a relevance in removing the apparent contradiction. In this context, his thought becomes the link between the east and the

west, materialism and spirituality, the self and the univers, eternity and history.

(Religion and Man in the Poetical Works of Eliot and Iqhal)

مذہبی فکر۔ خطبات کے آئینے میں

آج ہم اکیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں۔ بیسویں صدی جو ماضی کا حصہ بن گئی ہے کئی جہتوں پر مختلف منظروں کی کہانی ہے۔ اس صدی میں جاگیردارانہ مزاج کی تبدیلی کے ساتھ متوسط طبقے اور عام آدمی کو اعتبار ملا۔ اس وجہ سے معاشرے میں ایک بنیادی تبدیلی کا ظہور ہوا۔ بیسویں صدی کے عظیم مورخ ٹوائن بی کا خیال ہے کہ اس دور کی تشکیل میں کئی عناصر کارفرما ہیں۔ ان میں یورپی تہذیب' یہودی تاریخ' ملت کا تصور' پان اسلام ازم (Pan Islamism)' بازنطینی' روسی منہاج' جدید مغرب اور ہندو فکر کے عناصر شامل ہیں۔ بیسویں صدی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ عقیدہ کے بحران سے دوچار رہی ہے۔ انگریزی کے مشہور نقاد ڈوگلس بش (Douglas Bush) کا خیال ہے کہ اب عہد میں کوئی مرکزی اور روایتی معاشرہ باقی نہیں رہا۔

سماج' کلچر اور مذہب کا ایک پیچیدہ عمل نظر آتا ہے۔ کچھ بنیادی سوالات بھی اس ضمن میں اُبھرتے ہیں۔ کیا فرد معاشرے کی پیداوار ہے؟ یا اس کی اپنی علحدہ نشوونما بنیادی اہمیت کی حامل ہے؟ ڈرخیم اور کامتے نے سماج کو خدا کے تصور کی جگہ رکھنے کی

کوشش کی اور اس طرح روح کے انکار نے بے شمار مسائل کو جنم دیا۔ مارکس نے جس کے اثرات عالمی معاشرے کے بہت بڑے حصے پر ایک عرصہ تک غالب رہے، انسان کو تاریخی اور جدلیاتی سانچوں میں تلاش کیا۔ کامتے، مارکس اور ڈرخیم نے انفرادی آزادی پر زور دینے سے احتراز کیا۔ اگر ہم انسان کو اپنے وقت کی پیداوار تصور کرنے کی کوشش کریں تو یہ ایک جزوی حقیقت کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اپنے عہد کے اثرات کا ردعمل ہی نہیں بلکہ اجتماعی شعور، ماضی، حال اور مستقبل کے امکانات کی ایک ملی جلی تشکیل ہوتا ہے۔

عصرِ حاضر میں سائنس اور ٹکنالوجی کی تیز رفتار ترقی کو جو اہمیت حاصل ہوئی ہے انسانی تاریخ کے سفر میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ سائنس نے معاشرے کے رجحانات اور دھرتی کے چہرے کو بدل کر رکھ دیا۔ مختلف تہذیبوں اور ادوار نے مختلف عناصر کو اپنے اپنے وقت کے سانچوں میں اہمیت دی۔ یونانی تہذیب میں خوبصورتی اور جمالیات کو مرکزی حیثیت حاصل رہی اور عیسائیت میں خودغرضانہ عناصر سے پاک معاشرے کی بنیاد رکھنے کی تبلیغ کی گئی۔ اسلامی تعلیمات میں توحید اور مساوات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ ہندومت اور بدھ مت میں مابعد الطبیعیاتی بنیادوں پر نظام کو استوار کیا گیا۔ ان میں رسومات پر مشتمل مذہبی ورثہ بھی ہے اور خدا سے انکار کی گنجائش بھی شامل ہے۔

عصرِ جدید نے ابتداء میں سائنسی تکبر کے سائے میں مادہ ہی کو نقطۂ آغاز اور آخری منزل قرار دیا۔ جب کائنات کے چہرے سے آہستہ آہستہ نقاب اٹھنے لگی تو

ایک ایسی دنیا بھی سامنے آئی جس کا انکار کیا جاتا رہا۔ اب مادہ کا تصور سائنس کے واحد غالب رجحان کی حیثیت سے باقی نہیں رہا ہے۔ آئین اسٹائن کے نظریہ اضافیت نے انقلابی تبدیلی پیش کی۔ مادہ اور توانائی کے نئے نظریات نے سوچ اور عمل کے زاویے بدل ڈالے۔ سائنس کے بطن سے جنم لینے والی ٹکنالوجی نے سماج کو بے شمار سہولتوں کی ایک کائنات دینے کے باوجود گہرے منفی اثرات بھی چھوڑے۔ آلات نے احساس مروت کو کچل ڈالا۔ نئی تبدیلیوں کے پس منظر میں ہمیں اقبال کی مذہبی فکر کا جائزہ لینا ہے۔

اسلام نے ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ میں مختلف نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ عرب سے نکل کر جو پیغام مغربی ایشیا' شمالی افریقہ جنوب مشرقی ایشیا' وسط ایشیا میں پھیلتا گیا وہ مختلف علاقائی تہذیبوں سے دوچار ہوتا رہا۔ اسلام نے ان تہذیبوں پر جہاں اثر ڈالا ہے وہیں معاشرتی پہلوؤں کے صحت مند عناصر کو بھی اس طرح جذب کرلیا کہ مذہب کی بنیادی روح متاثر نہ ہونے پائے۔ ردوقبول کا یہ سلسلہ ہر تہذیب کا حصہ رہا ہے ورنہ تہذیبیں Xenophobia کا شکار ہوجاتی ہیں۔ عصرِ جدید میں اسلام کو بے شمار مسائل کا سامنا ہے۔ عصرِ جدید جس کا آغاز یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک سے ہوتا ہے' مذہبی آمریت یا اس کے خلاف ایک بھرپور آواز تھی۔ یورپ کا نشاۃ ثانیہ عرب مسلمانوں کی دین ہے جس کے اثرات پہلے اسپین کی سرزمین پر پڑے اور بعد میں فرانس' اٹلی اور دوسرے مقامات بھی اس کے دائرہ اثر میں آگئے۔

انسان کیا ہے؟ اس کائنات سے اس کا رشتہ کیا ہے؟ اس کائنات کی تخلیق کس نے کی؟ اس کے پیچھے کونسا مقصد ہے؟ تقدیر کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو ہر ذی شعور انسان کے ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ یہ شعور کسی اتفاقی دھماکے کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ زندگی کو امروز وفردا کے پیمانوں سے دیکھنا نہیں چاہئے۔ انسان اقبال کی نظر میں وہ آئیہ کائنات ہے جس کی تلاش میں قافلہ ہائے رنگ وبو نکلتے ہیں۔ انسانی زندگی ہر دم تبدیلی کی منتظر ہے۔ کائنات میں تخلیق کا عمل مسلسل جاری ہے کیونکہ ہر دم صدائے کُن فیکون سنی جاسکتی ہے۔ تخلیق کے اس عمل میں اقبال انسان کو خدا کا شریک تصور کرتے ہیں۔ خدا کی ذات مخفی شے تھی۔ انسان اس کا اظہار ہے۔ جس انسان نے اپنے آپ کو پہچانا' وہ خدا کا عرفان حاصل کرتا ہے۔ توحید انسان کو زنجیروں سے نجات دیتی ہے۔ حکیم الامت کہتے ہیں کہ یہ انسان کا مقصد ہے کہ وہ خدا کا قرب حاصل کرے اور اپنے گرد وپیش میں کائنات کی گہری آرزوؤں میں شریک ہو۔ قرآن نے انسان کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ مولانا روم اور اقبال کے ہاں انسان کے صاحبِ اختیار ہونے کی بنیادی اہمیت ہے۔

فکرِ اقبال کی تفہیم میں خطباتِ اقبال کی بڑی بنیادی اہمیت ہے۔ یہ اسلامی فکر کی تشکیل نو کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ مذہب کی تخلیقی جہت پر زور دیتے ہیں۔ اس کتاب کے ابتدائیہ میں اس حقیقت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن' خیال سے زیادہ عمل پر زور دیتا ہے: دراصل خطبات کا مقصد ایک نئے علم کلام کی تلاش اور عصرِ حاضر میں مذہب کی

معنویت کو روشناس کراتا ہے۔ جدید انسان مذہب کو شک کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اس المناک صورتحال کے ساتھ ساتھ مذہبی قیادت کا قابلِ لحاظ طبقہ عصرِ حاضر سے ناواقف ہونے کی بنا پر آج کے انسان کے ذہنی خلفشار جذباتی فشار اور عقیدوں کے بحران کے پس منظر میں کوئی حقیقی تسکین کا سامان فراہم نہیں کرسکتا۔ علمائے دین نے جو طریق کار اپنایا ہے اس کی اہمیت سے انکار کئے بغیر اس حقیقت کے احساس سے دور نہیں رہ سکتے کہ اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے انسان کے سامنے ہزاروں مسائل کھڑا کر دیئے ہیں جس کی وجہ سے کہیں کہیں سائنس اور مذہب کا تصادم بھی نظر آتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی بھیانک تصادم نہیں ہے۔ مذاہب کا بنیادی کام وسیع تر سطح پر ہدایات فراہم کرنا ہے۔ اسلام نے فکر اور مشاہدے کے لئے جو اصرار کیا ہے وہ سائنسی منہاج کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

اقبال کا پہلا خطبہ علم اور مذہبی تجربے کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ باب اس سوال سے شروع ہوتا ہے کہ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں اس کی ساخت کیا ہے۔ اس طرح کے کئی سوالات مذہب' فلسفہ اور شاعری کا مشترک حصہ ہیں۔ عقیدہ مذہب کی جان ہے۔ وائٹ ہیڈ نے کہا تھا کہ عقیدوں کا عہد دراصل عقلی بنیادوں سے عبارت ہے۔ آج سائنس کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایک عقلی مابعد الطبیعیات کو نظر انداز کرتی ہے۔ عقلی بنیادوں کا آغاز خود حضورؐ کی ذات میں نظر آئے گا۔ حکیم الامت مذہب کو ایک Departmental

Affair تصور نہیں کرتے۔ اسلام کی تاریخ میں یونانی فکر کو ایک کلچرل قوت تسلیم کرنے کے باوجود اس کے منفی اثرات پر برہم ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا نقطہ نظر Anti - Calssical ہے۔ ہمارے وجود کو جس طرح مذہب متاثر کرتا ہے وہ ہمارے لاشعور کا بھی حصہ ہے۔

اقبال نے خطبات کے دوسرے باب ''مذہبی وجدان کی فلسفیانہ جانچ'' میں وائٹ ہیڈ کے حوالے سے بتایا کہ فطرت منجمد نہیں۔ زندگی پر میکانکیت کو منطبق نہیں کیا جاسکتا۔ مادیت اور سائنس کی میکانکیت نے انسان کے لئے بے شمار مسائل پیدا کردیئے ہیں جب کہ مذہب ایک کھلی حقیقت ہے۔ ان کے نزدیک زندگی لایعنیت کا نام نہیں۔ اس لئے وہ برگساں پر تنقید کرتے ہیں جو مقصدیت کے منکر رہے ہیں۔

اقبال تیسرے باب ''خدا کا تصور اور عبادت کا مفہوم'' میں تثلیث سے متعلق عیسائیت کی بعض الجھنوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ زوالِ آدم کے تصور سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ اسی زمین پر انسان کے شعور سے پہلے کی منزل ہے۔ یہ گناہ نہیں بلکہ علم کی ایک خاص سطح ہے (خطبات: ص 85)

چوتھے خطبہ میں انسان کی انا، اس کی آزادی اور بقا پر بحث کی گئی ہے حقیقی شخصیت ایک عمل ہے۔ اقبال نے انسانی وجود کی بہت ہی دلچسپ تعبیر پیش کی ہے جس سے اختلاف اور اتفاق دونوں ممکن ہیں۔

پانچویں خطبے میں پیغمبرانہ شعور اور صوفی کے شعور کے درمیان فرق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اقبال نے واضح انداز میں بتایا کہ حضور ﷺ کی ذات قدیم اور جدید کے درمیان ایک ربط ہے۔ پانچواں خطبہ ابن خلدون کے تاریخی شعور کا جائزہ لیتا ہے۔ اس میں ختم نبوت کی معنویت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

''اسلام کی تعمیر میں اصول حرکت'' میں بتایا گیا ہے کہ خونی رشتے نہیں بلکہ عقیدوں کی بنیاد سے اخوتِ آدم کا تصور ممکن ہے۔ خطبات کے مصنف نے تاریخ میں کھو جانے کو مسترد کیا ہے۔ یہہ ایک تخلیقی اندازِ فکر ہے جو احیا پرستی سے مختلف ہے۔ یہاں یہ پہلو قابلِ ذکر ہے کہ جہاں خطبات کے مصنف نے ماضی کے احترام کا سلیقہ سکھایا ہے وہیں وہ بنیادی تبدیلی کا تاریخی نقطہ نظر کے بجائے تخیلی انداز میں ''ہر لحظہ نیا طور۔ نئی برق تجلی'' کی روشنی میں جائزہ لیا ہے۔ اس لئے اجتہاد پر زور ہے جو صدیوں کے گرد آلودہ ملبے کے نیچے دب گیا تھا۔ اس سلسلہ میں اقبال قرآن کی رہنمائی کو اولین اہمیت دیتے ہیں۔ اجتہاد کے دوسرے ماخذ احادیث کو بھی گہری نظر سے مطالعہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اگر ہم ان احادیث کا مطالعہ یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ وہ کیا اسپرٹ تھی جس کے تحت آنحضرتؐ نے احکام قرآنی کی تعبیر فرمائی تو اس سے ان قوانین کی قدر و قیمت میں حقیقی مدد ملے گی۔ ان اصولوں کی قدر و قیمت ہمیں اپنے فقہ کی بنیادی ماخذ کی از سرِ نو تعبیر اور ترجمانی میں مدد دے گی۔ اجتہاد کا تیسرا ذریعہ اجماع قرار دیا گیا ہے اور اسلام کے قانون میں

اس کی بنیادی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اقبال کا اصرار ہے کہ فقہ اسلامی کی تشکیل نو میں مسلمان جرات سے کام لیں۔ کائنات کی روحانی تعمیر کے لئے آزاد قوموں کے لئے روحانی جمہوریت اپنی منزل قرار دیں۔ اقبال کے تصورِ خودی سے ایک آئڈیل سوسائٹی کا خواب ابھرتا ہے جہاں علاقائی وفاداریوں کی معنویت کم ہوجاتی ہے۔ اجتہاد کے دروازوں کو بند کرنے کی وجہ سے اسلام کا جو صحیح عملی تصور تھا وہ سامنے نہ آسکا۔ مذہب صرف ایک اخلاقی نظام ہی نہیں ہے وہ زندگی کے اساسی انقلاب کا نام ہے۔ کلیسائی نظام کے خلاف لوتھر کا احتجاج بھی کلیسا کی جبریت کے خلاف ایک بھرپور آواز تھی۔ پائیداری اور تبدیلی کو ہر دور میں ہم آہنگ کرنا ضروری ہے۔ اور اس طریقہ کار کا دوسرا نام ہی اجتہاد ہے۔

مسلمانوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کردیا اور جو اجتہاد ہوتا رہا ۔ وہ چار یا پانچ فقہا کے فریم ورک میں محدود رہا۔ اجتہاد کے دروازے بند کرنے کے تاریخی اسباب' تصوف کی آزاد خیالی اور سلاطین کے منفی اثرات تھے۔ اس کی وجہ سے کئی پیچیدہ وجوہات کی بنا پر اجتہاد کے بجائے تقلید کو ترجیح دی گئی۔ صدیوں کے جمود کے بعد ابن تیمیہ نے تقلید کے خلاف اپنے نقطہ نظر کا اظہار کیا اور کتاب اور سنت سے راست اکتساب کو ناگزیر قرار دیا۔ انھوں نے اپنے دور کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر مسائل کو حل کرنے کا حوصلہ بخشا۔ علامہ اقبال کے خیال میں اٹھارویں صدی میں محمد ابن عبدالوہاب کی تحریک امام ابن تیمیہ کا ایک تسلسل تھی جس کی وجہ سے صدیوں کے گرد و غبار کو چھٹنے میں مدد مل سکی۔ حکیم الامت

کہتے ہیں کہ مذہب اسلام نے عالمگیر برادری کے استحکام کے لئے زور دیا ہے۔ وہ حضورؐ کی ذات کو زمانہ قدیم وجدید کے لئے حد فاصل قرار دیتے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کے مشن اور ختم نبوت کے تعلق سے علما کا خیال ہے کہ قدرت نے جب محسوس کیا کہ انسانی شعور کو اس سطح پر پہونچادیا گیا ہے کہ وہ دی ہوئی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کرسکتا ہے تو دور پیغمبری کا اختتام عمل میں آیا۔

قرآن کا نظریہ جمود کے بجائے حرکت ہے۔ اس الہامی کتاب نے فکر انسانی پر تحدید عائد نہیں کی ہے ۔ اسلام کا آغاز شاعرِ مشرق کے نزدیک (Inductive Intellect) کی ابتدا ہے۔ انسان کے لئے فطرت تاریخ اور تجربہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اس لئے وہ تاریخ کے دھارے کو پیچھے موڑنا نہیں چاہتے۔ وہ ہر لمحہ آگے کی سمت دیکھنا چاہتے ہیں۔

اقبال ''کیا مذہب کا امکان ہے'' میں کہتے ہیں:

''جس مایوسی اور دل گرفتگی میں آج کی دنیا گرفتار ہے اور
جس کے زیر اثر انسانی تہذیب کو ایک زبردست خطرہ
لاحق ہے اس کا علاج نہ تو عہد وسطیٰ کی صوفیانہ تحریک سے
ہوسکتا ہے اور نہ جدید زمانے کی وطنی قومیت اور لادین
اشتراکیت کی تحریکوں سے۔ اس وقت دنیا کو حیاتِ نو کی

ضرورت ہے اگر عصر حاضر کا انسان دوبارہ وہ اخلاقی ذمہ
داری اٹھا سکے گا جو جدید سائنس نے اس پر ڈال رکھی ہے
تو صرف مذہب کی بدولت ...... وہ اس زندگی میں
انفرادیت پیدا کرتے ہوئے آگے چل کر بھی اسے محفوظ
اور برقرار رکھ سکے گا ...... مذہب جہاں تک اس کے
مدارج عالیہ کا تعلق ہے نہ تو محض عقیدے کا نام ہے نہ کلیسا
اور رسوم ظاہری کا۔ لہذا جب تک انسان کو اپنے آغاز و
انجام کی کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی وہ کبھی اس معاشرے
پر غالب نہیں آ سکتا جس میں مسابقت نے ایک نہایت
غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے.... اس تہذیب و تمدن پر
غالب آ سکتا ہے جس کی روحانی وحدت اس کی مذہبی اور
سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے پارہ پارہ ہو چکی
ہے۔

مذاہب نے امید اور خوف کے ذریعہ انسانی فکر اور جذبوں کو زندگی کو کہیں
بے معنی نہیں بتایا۔ پیغمبروں کے ظہور کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ انسانی معاشرے میں انقلاب
برپا کریں۔ یہ انقلاب نئی ذہنی فضا کی تشکیل، روحانی انقلاب اور ارضی تبدیلی سے ہم آہنگ

ہوتا ہے۔ مذہب' عقیدہ' تجربہ' فکر' اخلاقیات' معاشیات' نفسیات' عمرانیات اور زندگی کے مختلف شعبوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں مذہبی کلچر بھی جنم لیتا ہے۔ مذہب اور تہذیب کے دائروں کو متعین کرنے میں سوشل سائنس کے ماہرین کا شدید اختلاف نظر آتا ہے۔ کوئی مذہب کو وسیع تر اصطلاح تصور کرتا ہے تو کوئی تہذیب کی وسعتوں پر زور دیتا ہے۔ اقبال نے مذہب' تہذیب' عمرانی نظام کو اپنی فکر کا حصہ بنایا۔ ان کا نظامِ فکر تاریخی عوامل کو نظر انداز نہیں کرتا۔ بیسویں صدی کے عظیم مورخ ٹائن بی نے بھی اس حقیقت پر روشنی ڈالی۔ وہ آخر کار مذہب کی مرکزیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

اقبال نے اپنے فکری نظام میں قدیم مذاہب کی اہمیت اور معنویت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اسلامی ورثہ اپنے ماضی کی تردید نہیں کر سکتا۔ تاریخ' تہذیبوں کے تصادم اور ان کی یگانگت' ردو قبول کے عمل کے ذریعہ پیش کرتی ہے۔ ہندوستانی پس منظر میں حکیم الامت اس کی معنویت سے یکسر انکار نہیں کرتے۔ ان فلسفیوں' جامد دینیاتی فکر کے رہنماؤں اور صوفیوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے مذہب کی تعبیر اور تشریح کی ہے۔ اقبال ایک بہت بڑے کینوس پر مذہب کی تصویر بناتے ہیں جہاں فلسفہ' مذہب' شاعری' فکر اور سائنسی منہاج کا ایک خوبصورت توازن ملتا ہے۔ وہ عقل کی مجبوریوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں جس کی وجہ سے کینٹ ول اسمتھ کو ابتدا میں تاریک خیالی کا گمان ہوا۔

اقبال نے سیکولرازم' سرمایہ داری' فسطائیت' جمہوریت پر اپنے مخصوص انداز فکر

کی ترجمانی کی ہے۔ مغربی استعماریت اور مادہ پرستی ،ضمیر مغرب کا تاجرانہ انداز اور مشرق کا مریضانہ انداز ان کی تنقیدوں کا نشانہ بنے ہیں۔

اسرارِ خودی میں انسان کی انفرادیت اور رموز بیخودی میں فرد اور سماج کے رشتوں کے استحکام کے تصورات میں ایک توازن ملتا ہے ۔ فرد کو نظر انداز کیے بغیر سماج سے ہم آہنگ ہونے کا یہ اندازِ فکر تنقید نگار کو تناقص محسوس ہوتا ہے ۔ ضربِ کلیم عصرِ حاضر کے تناقصات کے خلاف اعلان جنگ ہے ۔ گلشن راز جدید میں اقبال نے مابعدالطبیعیاتی مسائل' انسان کا مقام' جبر اور قدر کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے پورے شعری سفر میں انسان کے صاحبِ اختیار ہونے کی بنیادی اہمیت ہے۔

اقبال' آزاد' آروبندو اور ٹیگور کے ہاں ہمیں مذہبی سرچشموں سے انسانیت کا پیغام ملتا ہے۔ حکیم الامت کی مذہبی انسان دوستی اس جذبے کو صرف سیاسی خانوں میں مقید کرنا نہیں چاہتی ۔ رادھا کرشنن نے یوم اقبال کی ایک تقریب میں ان کے عقلی اور روحانی مذہب کے شدید احساس کو اپنے فکری ڈھانچے سے مماثلت کا احساس دیا۔ ڈاکٹر عابد حسین کہتے ہیں کہ جدت پسندوں میں کوئی ایسا نہیں جو تہذیب کی بنا مذہب پر رکھتا ہو۔ ان کے خیال میں جدید طرزِ فکر کے سچے نمائندے اقبال ہیں۔ شاعرِ مشرق نے ٹیگور سے زیادہ آزاد خیالی سے کام لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ تحقیقی سفر میں ایک فلسفی کے روپ میں سامنے آئے اور عملی حیثیت سے تنقیدی فکر ان کا اہم سرمایہ رہا۔

مذہب یقین کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ سائنس کی بے پناہ ترقی کے باوجود اس کے Myopic Vision نے اس کی اہمیت سے انکار کیا ہے۔ مختلف شعبوں اور علوم سے تعلق رکھنے والوں نے اپنی اپنی نظر سے اس کا احتساب کیا۔ کروچے مذہب کو مائتھالوجی سے تعبیر کرتا ہے۔ اسے یہ شاعری کی ایک صنف نظر آتی ہے۔ ڈرخیم اسے عمرانیات میں تلاش کرتا ہے۔ برٹینڈ رسل کو اس کائنات میں ایسے شواہد ہی نظر نہیں آئے جن کی بنیادوں پر کسی مطلق حقیقت کو تسلیم کیا جا سکے۔ مارکسی نقطۂ نظر نے مذہب کو افیون کی گولی قرار دیا۔ حالانکہ اس کا اہم کام یہ ہے کہ وہ خوف اور غم سے نجات دلائے۔ اقبال مذہب اور فلسفیانہ فکر کے درمیان خط فاصل کھینچتے ہیں۔ وہ مذہب کو صرف زندگی کی حقیقت پر غور کرنے کا نام نہیں دیتے بلکہ زندگی کی سطح کو بلند کرنے کے ایک مربوط و مناسب عمرانی نظام کی تشکیل کا سفر سمجھتے ہیں (ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر ص: 75) وہ مذہب کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا میں سینکڑوں مذہب پیدا ہوئے ان کا ارتقا ہوا اور وہ مٹ بھی گئے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان کی عقل کے نشو و نما کے ساتھ نئی ضروریات پیدا ہوتی ہیں جس کے لئے نئے علم کلام کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کی جانب واضح انداز میں بتایا کہ ان کی فارسی نظموں کا مقصد ایک جدید نظام کی تلاش ہے (اقبال نامہ اول: 472)

وہ ان مذاہب پر تنقید کرتے ہیں جن کے ہاں راہبانہ نظام پرورش پاتا رہا ہے۔

ان کے خیال میں وہ مذہب اپنی معنویت نہیں رکھتا جس کا دنیا کی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں۔ مذہب اگر نجی معاملہ بن جاتا ہے تو اس کا اخلاقی نظام بھی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ سیاسیات اور اخلاقیات سے عصرِ حاضر میں ایک نئی فضا نظر آتی ہے۔ جہاں وہ عمرانی نظام پر زور دیتے ہیں اس کو انقلاب کی آخری منزل قرار نہیں دیتے۔ مذہب کی حقیقی پاکیزگی ہی سب سے بڑا انقلاب ہے۔ (اقبال نامہ دوم: ص 17)

حکیم الامت کے تصور مذہب میں دین اور سیاست کی دوئی نہیں ہے ان کے درمیان تفریق کو حقائق اسلامیہ کے خون سے تعبیر کرتے ہیں (اقبال نامہ حصہ دوم) وہ مذہب کو افراد اور مملکتوں کی زندگی میں اہم طاقت تصور کرتے ہیں اور تعلیم کو لادینی بنادینے کے مخالف ہیں۔ انہیں یورپ کے تعلیمی نظام پر اس نقطہ نظر سے تشویش تھی۔ انھوں نے روح اور مادہ کی تفریق کو بھی اسلام سے متصادم بتایا ہے۔ ان کے خیال میں عیسائیت یورپ میں ایک رہبانی نظام کی حیثیت سے متعارف تھی جو بعد میں ایک وسیع کلیسائی تنظیم میں ڈھل گئی۔ لوتھر کا احتجاج اس تنظیم کے خلاف تھا کیونکہ اس طرح کے نظامِ سیاست کو مسیحیت میں کوئی جگہ نہ تھی۔ اسی لئے وہ اس کے احتجاج کو حق بجانب قرار دیتے ہیں۔ رسول اکرمؐ کے مذہبی واردات کی نوعیت پر قرآن کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ یہ مسیحیت سے مختلف ہے کیونکہ یہ انفرادی واردات نہیں بلکہ ایک عمرانی نظام کی تشکیل ہے۔ اور اس سے ایک ایسے نظام سیاست کی بھی بنیادی پڑی جہاں قانونی تصورات کی کارفرمائی ہے

لیکن اس کی ''عمرانی اہمیت'' کو اس بنیاد پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا ماخذ وحی والہام ہے۔ اسلام ایک اخلاقی نصب العین اور ایک طرح کی عمرانی ہیئت ہے۔

اقبال وطن کی محبت کو ایک فطری جذبہ قرار دیتے ہیں۔ انسان کی اخلاقی زندگی میں وہ نیکی کا درجہ رکھتی ہے۔ نسل اور حدود ملک کی بنا پر اقوام کی تنظیم حیات اجتماعی کی ترقی کے لئے ایک عارضی پہلو ہو تو انہیں اس پر اعتراض نہیں۔ جغرافیائی اصطلاح کے لحاظ سے یہ اسلامی اصولوں سے متصادم نہیں لیکن نسل اور ملک کی حدبندیاں '' انسانی قوت کا مظہر اتم'' تصور کر لی جائیں تو یہ خطرناک ہیں (اقبال نامہ اول: ص469)

ان تصورات کی روشنی میں مسلم مملکتوں کو اپنی خودی میں عارضی طور پر ڈوب کر ایک مضبوط توانا جمہوریتوں کا خاندان بننے کی وکالت کرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک علحدہ مملکت کے تصور کو کیوں پیش کیا۔ کیا یہ آفاقی جذبے کی نفی نہیں ہے۔؟ اس سلسلے میں یہ بات عرض کر دی جائے کہ اقبال کا تصور اس سلسلہ میں کسی ایک نقطہ پر نہیں رہا۔ ایک لمحہ وہ بھی تھا جب انھوں نے '' I am not protagonist of Pakistan '' کہا۔ ایک مفکر کو اپنے عہد اور ماحول پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ ایک چیلنج بھی بن سکتا ہے اور مختلف دباؤ اور اثرات کے تحت اسے نظریات میں تبدیلی بھی کرنی پڑتی ہے۔ علامہ اقبال نے اس بات کو ترجیح دی کہ تہذیبوں کا مشترک سفر جاری رہے لیکن تاریخی حقائق کی تلخیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے

وہ اس پر تردد کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی مذہبی فکر اس طرح ایک ہمہ جہتی سماج کے لئے اپنی معنویت نہیں کھودیتی۔

جاوید نامہ کو اقبال کا شاہکار کہا جاتا ہے۔ اقبال کی فکر' وسیع انسانی تاریخ کے تناظر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس شعری مجموعہ میں ماضی کی پرچھائیاں ہیں' حال کی الجھنیں ہیں' مستقبل کے خاکے ملتے ہیں' سیاسی' سماجی' تہذیبی' مسائل ہیں' پیغمبروں کی کائنات ہے۔ روح اور جسم کا سفر ہے۔ ڈیوائن کامیڈی اور جاوید نامہ کا بنیادی فرق یہ ہے کہ ڈانٹے نے ایک مخصوص تنگ نظر مذہبی تجربے کو اپنے عہد کے تصورات کی روشنی میں دیکھا مگر اقبال کا ہیومانزم جاوید نامہ میں نمایاں حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان کا مذہبی تصور ایک انقلابی انداز کا ہے۔ اس میں مشرقی فکر کا عرفان اور مغربی فلسفوں کی عقلیت کا ایک امتزاج ہے۔ اقبال کا ماورائی مسلک انسانیت تاریخی عمل کی کسوٹی پر مذہبی تجربے کو دیکھتا ہے اور ان کا تصورِ وقت' روحانی تجربے اور تاریخ میں ایک فعال ارتباط پیدا کرتا ہے۔ اس مجموعہ کلام میں ہمیں مختلف تہذیبوں کا ایک Mosaic ملتا ہے۔ تاریخ، علم اور عرفان کا یہ سرچشمہ ہے۔

مذاہب کا معروضی تقابلی مطالعہ انسانی فکر کو محدود تناظر سے نجات دلاتا ہے۔ تاہم اس حقیقت سے بھی آنکھیں نہیں چرانا چاہئے کہ ایسی کوئی کوشش جو مختلف مذاہب کی قدروں کو ملا کر کسی ایک نئے مصنوعی اور غیر الہامی مذہب کو جنم دینے کا سبب بنے وہ ایک

مضحکہ خیز حرکت بن جاتی ہے۔ اکبر کا دین الٰہی بھی ایک ایسی بھیانک اور مضحکہ خیز غلطی تھی جس نے سیاسی پشت پناہی کے باوجود دم توڑ دیا۔ مختلف مذاہب کی اپنی اپنی صداقت کے باوجود روحانی تجربوں کی انفرادیت اس کے اپنے سیاق وسباق اور مخصوص مزاج کی روشنی میں مناسب فضا فراہم کرتی ہے۔

جدید عہد میں برصغیر کے اسلامی پس منظر میں دانشوروں کی ایک کہکشاں ملتی ہے۔ حالیہ عرصہ میں ان میں اقبال اور آزاد دو بڑی ہم عصر قدآور شخصیتیں رہی ہیں۔ یہ شخصیتیں مسلمانوں کے لئے قدرت کا انمول عطیہ رہیں۔ ہنگامی سیاسی حالات میں محبت اور نفرت کے جذبوں نے ان دونوں شخصیتوں کو الگ الگ تناظر میں دیکھا۔ مسلمانوں نے محبت کے عالم میں اقبال کو وہ مقام ضرور عطا کیا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے تاہم ایک عالمی ورثے کو انھوں نے صرف اپنی ہی متاع سمجھ کر ان کے پیغام کو محدود کیا۔ حالیہ عرصہ میں اقبال کی اس آفاقی جہت کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں کام ہوا ہے ورنہ انہیں خالص مسلمانوں کے شاعر بنا کر پیش کرنا ظلم ڈھانے کے مترادف ہے۔ ایک طرف مسلمانوں کا یہ وفور جذبات سے قدر شناسی کا مسئلہ تھا تو دوسری طرف کٹر جارحانہ فرقہ پرست طبقہ نے انہیں تنگ نظر اور مسلم فرقہ پرست سمجھا، اسی لئے آزاد ہندوستان میں ایک عرصہ تک اقبال کی جلاوطنی کا خاموش اعلان تھا۔ حالات بدلے اور ان کے پیغام کی صحیح تفہیم ہوئی۔ ان کا آفاقی پیام ساری دنیا کے لئے ایک انمول خزانہ ہے۔

سعید احمد اکبر آبادی نے اسلامی قوانین کی انفرادی اور اجتماعی کوششوں کو دراصل

اقبال کے خوابوں کی تعبیروں سے موسوم کیا۔ جاوید اقبال نے ترکی، دمشق اور قاہرہ کے دانشوروں کے حوالے سے بتایا کہ گذشتہ تین صدیوں میں خطبات جیسی کتاب نہیں لکھی گئی۔

خطبات ایک مبسوط کتاب ہے۔ نثر کی وجہ سے اس میں شاعری کی طرح ابہام نہیں ہے۔ اقبال کا وژن مجموعی حیثیت سے نثر اور شاعری کے امتزاج سے مکمل ہوتا ہے۔ خطبات اور کلام کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر یا ایک ساتھ مکمل تفہیم حاصل کی جا سکتی ہے۔

نوجوانوں کا رول اقبال کی نظر میں

اقبال نے اپنی شاعری میں بیسویں صدی کے اہم مسائل کا احاطہ کیا ہے جس میں نئی نسل کو انقلاب کا ترجمان دیکھنے کی شدید آرزو بھی شامل ہے۔ انیسویں صدی میں افریقہ اور ایشیا غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہے۔ بیسویں صدی میں عام انسان کی بیداری اور جمہوری قوتوں کے استحکام کے ساتھ نوجوانوں نے مشرق اور مغرب میں اساسی رول انجام دیا ہے۔ اقبال کی نظر میں نوجوان' عالم نو کی تشکیل میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے شاعرِ فردا کی حیثیت سے اپنی بصیرت اور عرفان کے ذریعہ فکر ونظر کے جو چراغ جلائے ہیں ان سے نئی نسل کے لئے اندھیری راتوں اور داغ داغ اجالاسی کیفیتوں کو صبح نو کی روشنی ملتی ہے۔ پرانی نسلوں کو یہ حقیقت تسلیم کرنی چاہئے کہ زندگی' ذوقِ سفر اور انقلاب سے عبارت ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ تازہ ہے شانِ وجود

اقبال کے تصور میں شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام ہے۔وہ انسان کے وسیع تر امکانات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ان کی ابتدائی نظمیں' بچوں اور نوجوانوں کی کردار سازی کے لئے اہم رول ادا کرتی ہیں۔اردو میں بچوں کے ادب پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔بچوں کا ادب کسی بھی لسانی تہذیب کے لئے بہت ضروری ہے۔مگر المیہ یہ ہے کہ اس کو ثانوی اہمیت دی گئی۔ادیبوں اور شاعروں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ بچوں کے ذہنوں کو جب تک جلا نہیں بخشی جائے گی ادب کے نئے قارئین کی نسل تیار نہیں ہوگی۔اقبال جیسے عظیم شاعر نے بچوں کے ادب کو نظر انداز نہیں کیا۔''بچے کی دعا'' میں زندگی کو شمع کی صورت دیکھنے کی آرزو ہے۔زندگی وطن کی زینت بن کر رہنا چاہتی ہے۔وہ علم سے فیضان کی آرزو میں جیتی ہے۔غریبوں کی حمایت' دردمندوں سے محبت اور نیکی پر چلنا اور برائی سے پرہیز اس کے خمیر میں شامل ہے۔''پہاڑ اور گلہری'' میں اس بات کا اظہا رہے کہ حقیقی بڑائی حرکت و عمل کا دوسرا نام ہے۔''ایک مکڑی اور مکھی'' نظم خوشامد کے اسیر ہونے سے محفوظ رہنے کی تلقین کرتی ہے۔''ایک گائے اور بکری'' میں بتایا گیا ہے کہ انسان اس دنیا کا شاہکار ہے۔''پرندے کی فریاد'' غلامی کی لعنت سے خبردار کرتی ہے۔ایک دوسرے کے کام آنے کا احساس دلاتی ہے۔ ان کی ایک نظم شخصیت کی تعمیر کے

طریقِ کار کو متعین کرتی ہے۔ ماں کی وہ شدید محبت ہے جو تربیت کو نظر انداز کر کے آنسوؤں سے چراغ گُل کر دیتی ہے۔ اقبال نوجوانوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق ' میری نظر بخش دے

اور اس دعا کے ساتھ یہ تلقین بھی ہے:

شمع کی طرح جییں بزمِ گہہِ عالم میں
خود جلیں ' دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اپنے بیٹے جاوید اقبال کو گراموفون کی خواہش پر انھوں نے لکھا تھا کہ دیارِ عشق میں ایسا مقام پیدا کرنا چاہئے جس سے نئے روز جلوہ گر ہوں۔ انھوں نے اپنے فرزند کے حوالے سے نئی نسل کو یہ پیغام دیا ہے کہ غریبی میں نام پیدا کرنا چاہیے اور خودی کو بازار کی متاع بنانے سے گریز ضروری ہے۔ جاوید نامہ کے آخر میں فرزند کے حوالے سے وہ نئی نسل کو بتاتے ہیں کہ مسلمانوں نے دین وملت کو بیچ دیا ہے جس کی وجہ سے نمازیں بے نور ہیں اور مذہب صرف کتابوں کے اندر بند ہے۔

حکیم الامت محسوس کرتے ہیں کہ نئی نسل کا المیہ' بے تعلقی' ناامیدی' اور غلط تربیت کی وجوہات کا نتیجہ ہے۔ وہ خودی پر زور دیتے ہیں اور اپنی ذات کے امکانات سے انکار ان کے نزدیک کفر ہے۔ زندگی صرف پرواز کا نام ہے۔ دورِ حاضر کے مادہ پرستانہ

سماج کو دیکھیے اور صحرا نشینوں کی سادگی بھی دیکھیے جن کے قدموں میں شہنشاہوں کے کنگن تھے۔ وہ سرورِ عالم ؐ کی ذات کو نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ قرار دیتے ہیں۔

آج کے دور میں رقصِ جان سے رقصِ بدن کا سفر ایک پیچیدہ عمل ہے۔ انسانی قدروں کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ خاندان ٹوٹ رہے ہیں۔ مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب نے دنیا کو شدید بحران سے دوچار کر دیا ہے۔ مسلمانوں کے علمی کارنامے ایک ہزار سال کی شاندار ذہنی زندگی کے آئینہ دار ہیں مگر عصرِ جدید میں ابھی انہیں وہ حوصلہ نہیں ملا ہے کہ زندگی کو نئی سمت دے سکیں۔ اقبال دراصل ایک نئی مشرقیت کے علمبردار ہیں وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے کہ مغرب فعّال ہے اور وہ اس مثبت قدر سے گریز کرنا نہیں چاہتے۔ ان کا مجموعۂ کلام ضربِ کلیم 'عصرِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ ہے اور وہ اس اعلان سے نوجوانوں کو وابستہ کرتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

مغرب کی خالص نقالی کے اندازِ فکر نے مشرق کو خود اپنی نظر سے گرا دیا ہے۔ دو تہذیبوں کے ارتباط اور تصادم میں اس طرح کی صورت حال کا ابھرنا کسی حد تک فطری بھی ہے اس لئے اقبال نے اسلامی تاریخ اور کلچر کے سرچشموں کی جانب نوجوانوں کی توجہ مبذول کروائی ہے:

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

تمدن آفریں ' خلاقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارہ

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرانشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دارہ ' جہانبان و جہاں آرا

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا

'کلامِ اقبال میں شاہین کی علامت بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ جو بلند پروازی'

تیز نگاہی، بیکرانی اور خلوت کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ نوجوانوں سے کہتے ہیں۔:

جوانوں کو میری آہِ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اقبال نے مذہب کا انقلابی شعور دیا اور یہ ہمارے لئے ایک اہم تہذیبی سرمایہ ہے۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

ہے دوڑتا اشہب زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق' انتہا حسن

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

اقبال نے نوجوانوں سے کہا تھا۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

عصر حاضر کی حالت بھی اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ نوجوان اپنی بے پناہ تخلیقی قوت' توانائی اور انقلابی فکر کے ذریعہ اس جہان کی تشکیل نو میں اپنا حق ادا کریں۔

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کردے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کردے

فلسفۂ حیات۔ شاعری کے حوالے سے

زندگی کی رہ گزر پر ایک عام آدمی اپنے دامن میں شاید زندگی کا کوئی مبسوط فلسفۂ حیات نہیں رکھتا ہو لیکن ایک مفکر اور دانشور شاعر' زندگی اور کائنات کو مربوط انداز میں دیکھتا ہے۔ مشرقی دنیا اور مغرب میں بے شمار نظریے سامنے آئے جہاں زندگی کو بصارت اور چشمِ بصیرت سے دیکھنے کا حوصلہ ملا۔ اردو کے ایک مشہور شاعر چکبست نے زندگی کو عناصر کے ظہور ترتیب اور موت کو ان اجزا کے پریشاں ہونے سے تعبیر کیا۔ خالص سائنسی منہاج' زندگی کے فلسفوں اور مابعد الطبیعیاتی سطح پر فکری رویوں سے قطع نظر یہ بات اپنی جگہ وزن اور حقیقت رکھتی ہے کہ اقبال مذہبی نقطہ نظر سے وسیع تر سطح پر روح کی ابدیت کے قائل ہیں اور زندگی کو ایک مرحلہ قرار دیتے ہیں جو آئندہ کی پس پردہ اور دائمی زندگی کے لئے ایک تیاری کا عمل ہے۔ اسی لئے زندگی عمل اور حرکت سے عبارت ہے۔

انسان کو اس زمین پر خلیفہ بنایا گیا۔ اس دھرتی پر اس کو وسیع تر اختیارات سونپے گئے ہیں تاکہ نئی تشکیل کا عمل جاری رہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

ہزاروں سال کی تہذیب اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ہر عہد لپنے خوابوں' تمناؤں اور آرزؤں کے آئینوں میں زندگی کو خوبصورت بنانے اور آرائشِ جمال کے لئے ہمہ تن مصروف رہا ہے۔

ہندوستانی فکر جو ہزاروں سال پر محیط ہے بے شمار تبدیلیوں سے ہم کنار ہوتی رہی ہے۔ اسلام نے یہاں اپنی آمد کے بعد اساطیری دھندلکوں کے بجائے حقیقتوں کے دامن میں زندگی گزارنے کا نیا شعور اور حوصلہ بخشا۔ مغربی دنیا میں نشاۃ ثانیہ کے بعد سائنسی شعور کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ اس نے فطرت کے دامن میں صداقت سے بھرپور نئے رازوں سے آگہی کا موقع عطا کیا۔ اقبال کی فکر میں جہاں ہندوستانی تصورات کی پرچھائیاں ملتی ہیں وہاں اسلامی تحریک کا گہرا ادرک اور مغربی دنیا سے شخصی آگہی بھی ملتی ہے۔ جرمنی کے نوبل انعام یافتہ ناول نگار اور شاعر ہرمن ہیس Herman Hesse نے دانشور شاعر کے فلسفہ میں ہندوستانی فکر اسلامی تصورات اور مغربی فکر کے تین اہم پہلوؤں کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ اقبال نے اپنے منفرد فلسفے میں ان تصورات کا انجذاب کیا۔

عالمی ادب کے عظیم شاعر اور ڈرامہ نگار' ولیم شکسپیئر نے دنیا کو ایک اسٹیج قرار دیا جہاں انسان اپنی بساط بھر حرکت کے بعد موت کی دھند میں کھو جاتا ہے۔ مشرقی دنیا کے ایک عظیم شاعر مرزا غالب نے کہا تھا۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اقبال نے بہت خوبصورت انداز میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ قدرت نے انسان کو رازداں بنایا اور راز اس کی نگاہوں سے چھپایا۔ لیکن انسان ان رازوں کا عرفان حاصل کرنے کے لئے جستجو کی راہوں پر محو سفر رہتا ہے:

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

شاعر مشرق نے حرکت اور عمل کے پیغام کو زندگی کے سفر سے جوڑ دیا۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ان کے خیال میں قرآن عمل کا درس دیتا ہے۔ بعض پچھلے مذاہب کی طرح اسلام صرف مابعد الطبیعیاتی سطح پر محدود نہیں۔ اسلام کے تصور مساوات نے زندگی کے کارواں کو انقلابی راہوں سے روشناس کرایا۔ ایک ایسے معاشرے کا عملی نمونہ پیش کیا جو رنگ و نسل' علاقہ واریت' حسب و نسب کی بنیاد پر امتیازات نہیں رکھتا۔ حجۃ الوداع میں رسول اکرمؐ کا پیغام دنیا میں استحصال کے خلاف ایک انقلابی تبدیلی ہے۔ عبادات کی سماجی معنویت بھی ہے۔ مسجد امتیازات کو مٹانے کی ایک طاقتور اور زندہ علامت ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

پیامِ مشرق میں خدا اور انسان کے درمیان مکالمہ کو خوبصورت شاعرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ان شعروں میں انسان کی (autonomy) کا احساس ہوتا ہے۔ انسان خدا سے کہتا ہے کہ تو نے رات دی اور میں نے چراغ جلایا۔تو نے بیابان و کہسار دیئے۔میں نے سبزہ زاروں کو سجایا۔تو نے زہر دیا میں نے تریاق دریافت کیا۔ انسان کو خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تخلیق اور تشکیل کی ذمہ داریاں عطا کی گئی ہیں اور حُسنِ عمل کا فیضان جاری ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

اسرارِ خودی میں حکیم الامت نے انفرادی سطح پر خودی کے امکانات سے روشناس کروادیا۔ رموز بے خودی میں اجتماعی خودی کا عمل کارفرما ہے۔ اقبال کے فلسفۂ حیات میں خودی کے تصور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

یونان کے فلسفی ارسطو نے کہا ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ڈارون کے فلسفہ نے انسان کو حیاتیاتی زندگی کا ایک تسلسل قرار دیا۔اس فلسفہ سے قطع نظر، انسان کا سماجی شعور ایک منفرد نوعیت کا حامل ہے اور اس کے حصے میں کائنات کی دوسری حیاتیاتی

زندگی بھی شامل ہے۔

اقبال کے خیال میں جو مذاہب صرف مابعد الطبیعیاتی سطح پر زندہ رہنے کی کوشش کرتے رہے وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مذہب کا سماجی زندگی سے ربط رکھنا ناگزیر ہے۔ اقبال نے اجتماعی شعور کے ساتھ ساتھ فرد کی بنیادی اہمیت سے انکار نہیں کیا بلکہ اس کی اہمیت کو واضح کیا۔ فرد کسی بھی سماج کی بنیادی اکائی ہوتا ہے۔ اس کے خوابوں اور آرزوؤں سے یہ دنیا صد رنگ جلوؤں میں نکھر جاتی ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تیری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود
حیات کیا ہے ؟ اسی کا سرور و سوز حیات

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت ، وہ اندیشۂ نظر کا فساد

فقیہ شہر کی تحقیر کیا مجال میری
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

دل کی کشاد ڈھونڈنے کے عمل میں زندگی کی روشن خیالی مضمر ہے۔ یہاں کائنات کا عمل بتایا گیا ہے۔

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی
ہر ذرہ شہید کبریائی

اقبال زندگی کی صد رنگ تعریف پیش کرتے ہیں۔ زندگی کی تصویر کو حُسن سے اعتبار ملتا ہے۔ یہ سود و زیاں کے حلقہ سے برتر ہے۔

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ ہو جائے

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اقبال نے ایک دانشور شاعر کی حیثیت سے زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے اور دوسروں کو دکھانے کی سعی کی ہے۔

زندگی ہے میری ' مثل رباب خاموش
جس کے ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش

اقبال نے حیدرآباد میں قطب شاہی خاندان کے مقبروں کو دیکھ کر ''گورستان شاہی'' نظم لکھی۔ یہ نظم زندگی اور موت کے فلسفوں کا انکشاف ہے۔

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا ' اڑ گیا

نظم ''فلسفۂ غم'' میں وہ کہتے ہیں:

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سرابِ زندگی

شاعر نے زندگی کی ہر دم رواں کشمکش کے تعلق سے ''ارتقا'' نظم میں کائنات کی ایک حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

مختلف اشعار میں اقبال نے نئے نئے زاویوں سے حقیقتوں کے چہروں سے نقابیں الٹ دی ہیں۔

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے

''خضرِ راہ'' میں اقبال نے زندگی کی حقیقتوں کا ادراک کئی زاویوں سے پیش کیا ہے:

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ' ہردم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

عشق اور عقل کی کشمکش بھی اقبال کے فلسفہ حیات میں ایک جہت ہے۔ شاعرِ مشرق نے اس کائنات کا Essence عشق قرار دیا۔ اس سے زندگانی کی مختلف تصویروں کی گیلری سجائی گئی۔:

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مستی کی تصویروں میں سوز دمبدم

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

جیسا کہ مختلف مرحلوں میں اس کا ذکر ہوا ہے کہ تصورِ خودی اقبال کے فکری نظام میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبحگاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی ' نہ رہی تو روسیاہی

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زماں و مکاں اور بھی ہیں

زمانہ عشق کو سمجھا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

غالب نے کہا تھا:۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

انگریزی کے رومانی دور کے شاعر P. B. Shelley کے ہاں بھی امید کی توانا لہر نظر آتی ہے۔شیلی کا نقطۂ نظر Pluralistic ہے۔ وہ مختلف نقاطِ نظر کے درمیان ہم آہنگی تلاش کرتے ہیں۔ اقبال کے ہاں یہ صفت وسیع تر سطح پر اور متنوع انداز میں ملتی ہے۔شیلی کے ہاں امید٬ جہد٬ آزادی کی جو تعبیریں ملتی ہیں٬ وہ ان کے شعری سرمایہ کو ایک نیا رنگ بخشتی ہیں۔ تاہم روح اور ابدیت کے تعلق سے ایک کنفیوژن بھی ہے۔ مختلف نقاد٬ اپنے اپنے انداز میں اس کی تشریح کرتے ہیں۔ موت کا تصور٬شیلی کی شاعری میں کئی مقامات پر ملتا ہے۔شیلی نے Myth کے ذریعے بہت سے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔

زندگی قدرت کا انمول عطیہ ہے۔ اس عطیہ کو خوبصورتی سے استعمال کرنا چاہیے۔ یہ کائنات معنی سے بھرپور ہے۔ اقبال کے نزدیک لایعنیت کا فلسفہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جدید عہد میں لایعنیت کا فلسفۂ آرٹ اور ادب میں اپنا تماشہ دِکھا کر دھند میں کھو گیا۔ عصرِ جدید میں وجودیت اور مختلف نظریات نے اپنے مثبت اور منفی اثرات چھوڑے ہیں۔ کمپیوٹر عہد میں زندگی کی قدریں بدلی ہیں۔ لیکن ابدی صداقتیں٬ فلسفوں کے نشیب وفراز اور نظریات کی یلغار کی زد میں نہیں آتی ہیں۔ اقبال نے فلسفہ خودی٬ حریت کے تصورات٬ مردِ کامل کا نصب العین دیا۔ انھوں نے ایک نئے مشرق کا خواب دیکھا جس میں مغرب کی فعالیت بھی شامل ہے۔ انھوں نے زندگی کے صدرنگ جلووَں کو شاعر٬ فلسفی٬ صوفی اور کئی روپ ورنگ میں دیکھا۔ ان کا فلسفہ حیات آج بھی

ہمارے لئے معنویت رکھتا ہے۔ انگریزی ادب اور آرٹ کے مشہور نقاد ہربرٹ ریڈ نے کہا تھا کہ انگریزی شاعری نے جب جانوروں پر نظمیں لکھنا اپنا شعار بنالیا تھا اس وقت مشرقی دنیا سے اقبال کی ایک توانا شعری آواز ہمیں نظر آتی ہے۔ اس توانا شعری آواز میں فلسفۂ حیات ہے' کائنات کے رموز ہیں اور عصرِ جدید میں زندگی کے نئے مفاہیم ہیں۔ نسل درنسل کے قافلوں نے ان کے فلسفہ حیات کی اہمیت کو محسوس کیا اور توقع ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد !

اکیسویں صدی میں شاعرِ مشرق کی معنویت

مذہبی حسیّت Religious Sensiblity ادب کو وسیع تر شعور عطا کرتی ہے۔ تاہم بیسویں صدی کے مغربی انداز کے سیکولر مزاج نے اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ عصرِ جدید میں اس حقیقت کو فراموش کر دیا گیا کہ کلاسیکی ادب کا بڑا حصہ مذہبی شعور کا اظہار ہے۔ ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی تو خالصتاً مذہبی حسیّت کا ایک رزمیہ ہے جس کو دُنیائے ادب میں ایک اہم مقام دیا گیا ہے۔ انگریزی ادب کے اہم ڈرامہ نگار شیکسپیر کی تخلیقات میں تاریخی کرداروں کے ساتھ عیسائیت کا شعور بھی شامل ہے۔ مابعد الطبیعیاتی اسکول(The Metaphysical School) کے مختلف شعرا نے بھی مذہبی شعور کے ذریعے اظہار کے نئے امکانات پیش کیے۔ بیسویں صدی کی اہم شعری اور تنقیدی آواز ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ہاپکنس پر تنقید کرتے ہوئے یہ بات واضح کی ہے کہ ادب کا ایک اندازِ فکر وہ ہے جو صرف دینیاتی نقطۂ نظر کا ترجمان ہوتا ہے اور اس طرح کا ادب کوئی اعلیٰ ادبی اقدار کی تصویر پیش نہیں کرتا۔ لیکن ادب کا دوسرا نقطۂ نظر مذہبی شعور کو فن کارانہ سطح پر ایک نامیاتی وحدت کا اظہار بناتا ہے۔ ادب کی اعلیٰ خصوصیات

کا ترجمان ہو جاتا ہے۔ خود ایلیٹ کی شاعری اس بات کی ترجمان ہے۔ ویسٹ لینڈ (The Waste Land) سے فور کوارٹیٹس (Four Quartets) تک اپنے شعری سفر میں انھوں نے فن کارانہ انداز میں عیسائیت کے شعور کو برتا ہے۔ اس شعری کائنات میں ایک مسلسل تلاش ملتی ہے۔ یہ تلاش تشکیک سے یقین کی طرف ایک سفر ہے۔ شاعر نے اپنی ایک اہم نظم ویسٹ لینڈ میں بے جوڑ پیکروں کے انبار میں عصرِ حاضر کی تہذیب کو ماضی کے حوالوں سے دیکھا ہے۔ بظاہر اس نظم میں مذہبی شعور کی عکاسی نظر نہیں آتی تاہم ایک بے چین روح کا کرب ضرور ملتا ہے۔ یہی جستجو کا سفر کیتھولک مذہب قبول کرنے کے بعد واضح صورت میں مختلف نظموں ایش و ینسڈے (Ash-Wednesday)' راکس (Rocks) اور فور کوارٹیٹس میں ملے گا۔ فکر اور احساس کا یہ گھل مل جانا مختلف سطحوں پر مختلف انداز سے سامنے آتا ہے۔

اقبال کی شاعری بیسویں صدی کی توانا شعری آواز ہے۔ ان کے کلام میں مختلف دھارے ملتے ہیں جن میں قومی نظموں کا ابتدائی دور بھی ہے اور فطرت کی بے پناہ چاہت کا خوبصورت اظہار بھی' انگریزی ادب کے اثرات اور جرمن ثقافت کی جھلکیاں بھی۔ تاہم شعری سفر کے آغاز میں ایک خوابیدہ مذہبی حسیت کی لہریں شعری شعور کی سطح پر آسانی سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ شعر و ادب میں یہ مسئلہ بڑا اہم ہے کہ فن کی سطح پر کس طرح عرفانِ ذات' انسان اور کائنات کے مسائل کو پیش کیا جائے۔ وہ شاعری جس سے جذبہ اور فکر گھل

مل نہ سکیں، فنی لوازمات کی تکمیل نہیں کرتی ۔ وہ ایک خالص اعلان بن جاتی ہے ۔ جدید شاعری میں فن کار کی وابستگی، ترسیل کی ناکامی اور بیانات کے اکہرے پن اور دوسرے پہلوؤں پر مسلسل گفتگو ہوتی رہی ہے لیکن عصرِ جدید کے نقادوں کے ایک بڑے گروہ کا یہ اصرار کہ شاعری کو صرف علامتوں ہی کے ذریعہ برتا جائے، شعر کے مختلف رنگ وروپ سے صرفِ نظر کرنے کے مترادف ہے ۔ شاعری میں وہ بیانیہ اظہار بھی اہم ہوتا ہے جو درد کی تہذیب سے وابستہ ہو، اور اس کے اظہار میں شعری لوازم کو نظر انداز نہ کیا گیا ہو، تخیل کی کارفرمائی ہو، احساس کی شدت اور خلوص سے فن کی ترجمانی ہو ۔ اقبال نے شاعری میں نئے نئے محاورے، علائم، پیکر، تلمیحات کے ذریعہ ایک نئی شعری کائنات تخلیق کی ہے ۔ یہ شعری کائنات چند دینیاتی اُصولوں کا مرقع ہی نہیں ہوتی ۔

اقبال کی مسلسل جستجو کا محور جہانِ نو کی تلاش تھی ۔ ان کے خیال میں زمانے کے دامن میں تغیر ہی کو ثبات ہے ۔ ان کا نقطہ نظر احیا پرستی کا ترجمان نہیں بلکہ تازہ بستیوں کے آباد کرنے کے احساس سے سرشار ہے ۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

ماضی کی عظمت سے رشتہ استوار رکھ کر اگلے سفر پر نظر ہے ۔ اگرچہ وہ کہتے ہیں کہ ان کی تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے تاہم انھوں نے امت مسلمہ کو صدیوں کی

نیند سے جگانے کی کوشش کی ۔ وہ کچھ کامیابی سے بھی ہم کنار ہوئے ۔ ایک طرف انھوں نے استعماریت اور سامراجیت کی خونخواری کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی تو دوسری طرف نیشنلزم کے منفی تصورات پر ضرب لگائی ۔ انھوں نے ساتھ ہی ساتھ اسلامی فکر کے ورثے اور ماڈلس کے لیے نثر اور شعر کے حوالوں سے عقلی بنیادیں فراہم کیں ۔ روایت کی اندھی تقلید نئے افق پر سورج کی تابانی کو دیکھنے سے محروم رہتی ہے لیکن طرزِ کہن سے انحراف، قدامت اور جدیدیت کے درمیان کشمکش کا انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اثر ہوتا ہے ۔

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

انھوں نے قصۂ قدیم و جدید کے فرق پر بھی ایک خاص انداز سے نکتہ چینی کی ۔ اقبال نے مغربیت اور جدیدیت کے درمیان فرق واضح کیا ۔ حالانکہ ایک عرصہ تک یہ تصورات الجھن کا شکار رہے ۔ انھوں نے تصور خودی کے ذریعہ ایک فعال شخصیت کا خواب دیکھا، برصغیر میں طلسم برہمن دکھایا؛ ملّائیت کے خلاف آواز اٹھائی؛ حکیم الامت نے اسلامی فکر کی نئی تشکیل کو ناگزیر قرار دیا ۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اقبال کی تخلیقی فکر Cult نہیں بنتی ۔ وہ وسیع تر سطح پر ہر ایک مکتبِ فکر کے لئے سرچشمہ تحریک رہتی ہے ۔ اقبال جس جہانِ نو کی تلاش کا خواب دیکھتے ہیں وہاں انسانی آزادی کے پیغام سے عبارت لمحے ملیں گے ۔

اقبال کے مختلف شعری مجموعے زندگی کی بے شمار وسعتوں کا احاطہ کرتے ہیں تاہم ان میں ایک خاص مرکزی موضوع کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ **اسرارِ خودی** میں فرد کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے' **رموزِ بیخودی**' اجتماعی خودی کی آئینہ دار ہے۔ شجر سے پیوستہ رہ کر امیدِ بہار کا پیغام ہے۔ **ضربِ کلیم** دورِ حاضر کی کج رویوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے' **جاوید نامہ**' انسانی تاریخ کا ایک روحانی سفر ہے' **پیامِ مشرق**' **گلشنِ رازِ جدید** اور **بالِ جبریل** مختلف زوایوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

ایک تڑپتا ہوا دل' ایک دانشور شاعر' عصر حاضر کے بحران میں کئی زاویوں سے سرچشمہ تحریک ہے۔ وہ ایک نئی فکری لہر کے پیغمبر ہیں۔ وہ نئے سفر نئی منزلوں کی تلاش کا حوصلہ دیتے ہیں۔ مغرب پر ان کی تنقید کبھی کبھی غیر معروضی نظر آتی ہے۔

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائیدار ہوگا

شعر کے حوالے سے یہ رویہ جارحانہ محسوس ہوتا ہے۔ تاہم اقبال کی زندگی کا چراغ گل ہونے کے چھ دہائیوں کے بعد بھی مغربی دنیا میں خونخواریت ملتی ہے۔ کچھ امید کی کرنیں بھی پھوٹی ہیں۔ علوم تازہ سے سرشار مغرب نے علم و تہذیب کے خزانوں کو مالا مال بھی کیا ہے۔ جہاں ایک طرف مادیت اور صارفیت کا سیلاب آیا' وہاں جمہوری قدروں' اور انسانی آزادی کا احترام معتبر ہوا۔ انسان دوستی کے جذبہ کو فروغ ملا۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے منفی اثرات کی وجہ سے انسان مشین بن گیا ہے۔ احساس مروت کو آلات

نے کچل ڈالا؛ کلیسا سے بڑھ کر بینکوں کی عمارات نے اہمیت اختیار کر لی؛ جمہوریت میں بندوں کی گنتی مقدر بن گئی؛ یہاں انہیں تولا نہیں جاتا۔ اب بھی بہتر جمہوریت کے لئے یہ دنیا منتظر ہے۔ اقبال نے شاعرِ فردا کی حیثیت سے بے شمار امکانات کی نشاندہی کی۔ یہ امکانات ہمیں نئے سفر کا حوصلہ بخشتے ہیں۔ شاعرِ مشرق حقیقی معنی میں دیدۂ بینائے قوم ہیں۔

عصر حاضر سے تہذیب اور ثقافت میں بے شمار بنیادی تبدیلیاں در آئی ہیں۔ خاص طور سے بیسویں صدی نے اپنے دامن میں ہزاروں تبدیلیاں سمیٹ لی ہیں اور ان کا تسلسل اکیسویں صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ انفرمیشن ٹکنالوجی نے عالمی گاؤں کے تصور کو حقیقت کا روپ دیا۔ مشرق اور مغرب کے درمیان سیاسی اور معاشی سطحوں پر اب بھی بنیادی فرق ملے گا۔ مگر بدلتا ہوا عالمی منظر کہہ رہا ہے:

فاصلے کچھ گھٹ گئے ہیں اس طرح شہروں کے بیچ
ایک نقطہ بن گیا ہے یہ جہاں آنکھوں کے بیچ

پہلی جنگ آزادی 1857 کے بعد برصغیر میں مسلم فکر کے کئی دھارے ملتے ہیں لیکن جدید عہد کو سب سے پہلے جس ذات نے واضح انداز میں محسوس کیا وہ سرسید کی تھی۔ ان کی دانشمندانہ فکری قیادت اور تعلیمی نشاۃ ثانیہ کی تحریک نے برصغیر پر غیر معمولی اثرات مرتب کئے۔ انیسویں صدی سے ان اثرات کا فیضان اب بھی جاری ہے۔ سرسید کے بعض مذہبی تصورات اور ان کی تشریحات سے اختلاف ممکن ہے، مگر عصر نو کی تفہیم اور نئے

چیالنجس کا سامنا کرنے کیلیے جس حکمت عملی کو انھوں نے مرتب کیا' اس سے بہت حد تک گریز کرنا آسان نہیں ہے۔ بلکہ بسا اوقات اس طرح کا عمل فراریت کے مترادف ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ اکیسویں صدی کے پس منظر میں دنیا کے وسیع تر علاقہ سے کمیونزم کے دم توڑنے' بیسویں صدی کے اختتام تک کئی نظریوں کی موت' ایشیاء کی نئی بیداری' مسلمانوں کا چار صدیوں بعد بیدار ہونے کی کوشش کرنا' اسلامی جدیدیت Islamic modernism پر اصرار اور ان کی اہمیت سے سرسید کے مغرب کے تعلق سے تصورات کسی حد تک اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔ مشرق کی بازیافت نے فکر کی محدودیت اور سطحی نقالی سے نجات دی ہے۔ مشرق اور مغرب صرف جغرافیائی اکائیاں نہیں ہیں۔ یہ تہذیبی شناخت سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ مغرب کا نوآبادیاتی نظام' نسل' قومیت' کلیسا' سلطنت سے عبارت رہا۔ جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری سے نظروں کو خیرہ کرنے کی صلاحیت کم ہو رہی ہے۔ مشرق اب اپنے ماضی کی عظمت میں ہی گم ہونا نہیں چاہتا بلکہ شاندار مستقبل کی پرچھائیاں بھی دیکھنے کا منتظر ہے۔ وقت تیزی سے بدل رہا ہے۔ سیاسی کھلواڑ کے باوجود یہ دنیا عالمی گاؤں میں ڈھل رہی ہے۔

فیض احمد فیض نے ''ہماری قومی زندگی اور ذہن پر اقبال کے اثرات'' میں لکھتے ہیں کہ ذہنی زندگی میں جو تلاطم اقبال کے افکار سے پیدا ہوا ہے غالباً اس سے پہلے کسی بھی واحد مصنف' واحد ادیب یا واحد مفکر کے حصے میں نہیں آیا۔ اس طرح کا تلاطم کسی نے بھی

اقبال کے بعد پیدا نہیں کیا۔ فیض نے سرسید کا ذکر کرتے ہوئے کہا اقبال کی فکر کے مقابلے میں سرسید کی تحریک کا دائرہ کار محدود رہا ہے۔ بنیادی طور پر اس کا تعلق ہندوستان سے رہا ہے جب کہ اقبال کے افکار کا تعلق بہت وسیع ہے۔ فیض نے کلام اقبال کے دوسرے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کئی حقیقتوں کی جانب بھی توجہ مبذول کروائی ہے۔:

بہت سی باتیں جن میں محض وہم و گمان کے بل پر
لوگ سلوگنز (Slogans) کے طور پر استعمال کیا کرتے
تھے، اقبال نے ان کے سوچنے کا غور کرنے کا، مشاہدہ
کرنے کا، مطالعہ کرنے کا، تجزیہ کرنے، استنباط کرنے کا
اور اس سارے ذہنی پروسس (Process) سے گزر جانے
کا ڈھب سکھایا۔ صرف خواص کو نہیں بلکہ عوام کو بھی۔
اقبال نے لوگوں کے ذہن کو ان اثرات سے ایک حد تک
آزاد کرنے میں امداد دی جو غلامی کے سبب پیدا ہو گئے
تھے۔۔۔ ان کا آخری دور جو ان کی پختگی کا دور وہ ہے
جب کہ وہ انسانیت اور جملہ کائنات کے بارے میں اپنے
افکار کا اظہار کرتے ہیں۔ آفاقی طریقہ سے سوچنے کا
ڈھب اور اس کو سوچنے کی ترغیب۔ ہمارے ہاں اقبال

نے پیدا کی۔ ہمارے ہاں اس سے پہلے شعر یا تو تفریحی
چیز سمجھی جاتی تھی یا ایک غنائیہ سی چیز سمجھی جاتی تھی یا زیادہ
سے زیادہ محض ایک اصلاحی چیز سمجھی جاتی تھی اور یہ بھی حالی
کے بعد۔ شعر میں فکر اور شعر میں حکمت اور شعر میں وہ
عظمتیں جن کو ہم شاعروں سے نہیں فلاسفروں سے متعلق
کرتے ہیں، وہ محض اقبال کی وجہ سے ہمارے یہاں پیدا
ہوئی ہیں ۔۔۔ اقبال کی مثال ہمارے ہاں ایک ندی یا
ایک نہر کی سی نہیں ہے جو کہ ایک ہی سمت میں جاری ہو
بلکہ ان کی مثال تو ایک سمندر کی سی ہے جو چاروں طرف
محیط ہے۔ چنانچہ ان کو ہم ایک مکتبِ فکر نہیں کہہ سکتے ہاں
ان کو ہم ایک جامعہ سے یا ایک یونیورسٹی سے تشبیہ دے
سکتے ہیں۔

''زندگی بغیر مقصد کے بسر نہیں کی جا سکتی۔ کوئی اٹکاؤ، کوئی لگاؤ، کوئی بندھن ہونا چاہیئے، جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جا سکیں۔ یہ مقصد مختلف طبعیتوں کے سامنے مختلف شکلوں میں آتا ہے'' (غبارِ خاطر)۔ مولانا آزاد کا مقصدِ حیات غیر منقسم ہندوستان میں، اس عصر کی دوسری بڑی شخصیت اقبال سے مختلف نہ تھا۔ دونوں اسلام کی سر

بلندی کی تمنار کھتے تھے اور عالمِ انسانیت کو اپنے فکری سرچشموں سے سیراب کرنا چاہتے تھے۔ تاہم دونوں کے منہاج اور طبعیتوں میں بنیادی فرق تھا۔ تذکرہ میں اس بات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی کہ اقبال کی تحریریں الہلال کی بازگشت ہیں تاہم اس طرح کے بیان کے ذمہ دار آزاد نہ تھے۔ اقبال نے سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں اس سلسلہ میں شکایت کی۔ بعد میں مولانا آزاد نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ اقبال کی فکرِ اسلامی کی شروعات الہلال کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے درمیان خلوص کا ربط ضرور رہا ہے۔ الہلال کے پہلے صفحہ پر اقبال کی شعری تخلیق کی اشاعت شاعرِ مشرق کی عظمت کا اعتراف ہے۔ مولانا آزاد اقبال کو ملک الشعرا کے خطاب دینے کے حامی تھے۔ لیکن ان کے حلقہ بگوش اس بات پر معترض تھے کہ اس سے مسلم لیگ کو سیاسی فائدہ ہوگا۔ اس طرح کے سطحی اعتراض کی وجہ سے یہ تجویز آگے نہ بڑھ سکی۔ اقبال کے انتقال پر بھی آزاد نے اردو کے عظیم شاعر کی حیثیت سے خراجِ عقیدت پیش کیا۔

اقبال کے دل میں بھی آرزو تھی کہ آزاد سے ملاقات کا کوئی موقع نہ گنوائیں۔ ایک محفل میں انہوں نے خاص طور سے خواہش کی تھی کہ آزاد کے بازونشست کا انتظام کیا جائے تا کہ تفصیلی گفتگو ہو سکے۔ ایک بار کسی مسئلہ کے استفسار کے سلسلے میں انہوں نے ایک خط مولانا آزاد کو لکھا بھی ہے۔ تاہم پتہ نہ چل سکا کہ اس خط کے بعد کوئی پیش رفت

ہو سکی۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اقبال بے شمار علما کو ملّی اسلامی اور ملّی مسائل کے لئے خطوط لکھتے رہے تھے۔لیکن مولانا آزاد سے اپنے ذہن میں اٹھنے والے بے شمار سوالات کے جوابات نہیں مانگے۔

اقبال کے معاصرین میں مولانا ابوالکلام آزاد کی عبقری شخصیت نے بھی تاریخ کے ایک دور میں انقلابی خیالات سے روشناس کروایا۔**الہلال** کا صحافت کے میدان میں تاریخ ساز رول رہا ہے۔اقبال اور آزاد کے تعلق سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے رویوں میں فرق ملتا ہے۔ڈاکٹر سید عابد حسین نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے اقبال سے اپنے عشق کا غیر معمولی ثبوت دیا ہے کیونکہ انہوں نے مبالغہ کی حد تک ان کی تسکین کے لئے جذباتی وسائل مہیا کئے جب کہ آزاد نے طنز کے نشتر سے جراحت کا کام کرنے کی کوشش کی اور اپنی جھولی میں تلخیاں بھرلیں۔عصری ہندوستان میں آزاد کی بھر پور معنویت ہے تاہم وہ دلوں کی دھڑکنوں کا حصہ نہ بن سکے۔انہیں وہ اپنائیت نہ مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔غیر مسلم حلقوں میں بھی آہستہ آہستہ آزاد کے امیج کو مدھم کیا گیا۔خاص طور سے **India Wins Freedom** کے ان تیس صفحات کی اشاعت کے بعد جو تین دہائیوں تک راز کے پردوں میں چھپے ہوئے تھے۔جب انہیں بند کواڑوں سے نکال کر سورج کی روشنی میں رکھا گیا تو کئی اہم چہرے تاریک نظر آنے لگے۔

بڑی سے بڑی شخصیتیں، سوائے چند الہامی برگزیدہ روحانی شخصیتوں کے، ہر عہد

کے لئے مکمل معنویت نہیں رکھتیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے سفاک جبر کے باوجود' گاندھی کا صنعتی وژن' عصرِ جدید کے لئے معنویت نہیں رکھتا۔ نہرو کے سوشلزم کے تصورات نے بہت حد تک اپنی معنویت کھودی ہے۔

آج کے بے شمار مسائل پہلی جنگِ آزادی (1857) کے آس پاس اُبھرے تھے۔ آج ان کے جوابات یقیناً مختلف ہوسکتے ہیں کیونکہ زمانہ قیامت کی چال چل گیا۔ مغرب کے تعلق سے جو سرسید کا مفاہمانہ رویہ تھا آج ہمارے لئے معنویت نہیں رکھتا۔ سرسید نے روشن خیالی کی نرم دھوپ میں جو پودے لگائے تھے وہ برگد بن گئے۔ لیکن اس برگد کی اتفاقی جڑیں کچھ اور کھاد مانگتی ہیں۔ شبلی نے سرسید کے عہد ہی میں ان کی فکر کے جھکاؤ سے اختلاف کیا تھا۔ حالی کی نسل نے ایک متوازن مفاہمانہ رویہ اپنایا۔ اکبرالہ آبادی نے خالص مشرقیت میں پناہ ڈھونڈی جس میں مغرب کی نسیم سحر کا گزر ہی ممکن نہیں ہے۔ آج کے عالمی گاؤں کے کلچر میں' اس کی تمام بھیانک کمزوریوں اور استحصال کے باوجود اس کے وسیع اثرات ہیں۔ Xenophobia کی شکار قومیں عالمی ورثہ سے کٹ جاتی ہیں۔

اقبال نے نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ آنے والے ادوار پر بھی غیر معمولی اثرات چھوڑے ہیں۔ شخصیتوں اور اداروں کے دلکش قافلہ میں علی شریعتی بھی ہیں۔ شریعتی نے اقبال سے غیر معمولی استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے شاعرِ مشرق کو ''علی گونہ'' قرار دیا۔ اقبال کو دنیائے علم وفن کی بے شمار برگزیدہ ہستیوں نے خراجِ عقیدت پیش کیا

ہے۔لیکن یہ احساس اور خراج نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ دراصل شریعتی کی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں فکرِ اقبال کا نتیجہ ہیں۔اس لئے انہوں نے حُسینیہ درسگاہ میں اقبال کی تعلیمات پر بھی کافی توجہ دی تھی۔یوں تو ان کی زندگی کی صبح اقبال کی زندگی کے شام کے بعد آئی۔لیکن وقت کے فصل' حالات کی تیز رفتار ترقی کے پس منظر میں انہوں نے کم عمری میں فکر اور جہد کے زبردست امتزاج کے ساتھ ایرانی قوم کے ذہنوں کو بدلا۔ان کو نئی فکر دی۔ نئے راستے بنائے۔خودی کے پیغام کی تجدید کی۔مشرق کی عظمت کا احساس جگایا۔ استعماریت اور ملوکیت کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔پُر اسرار حالات میں ان کی موت شہادت کا پتہ دیتی ہے۔

علی شریعتی نے اقبال کی طرح ''اہل حرم کے سومنات'' سے مقابلہ کیا۔ حکیم الامت کے خلاف کفر کے فتوؤں کی فیکٹریاں وجود میں آئیں۔فتنہ پروروں کا ساتھ جب عوام نے چھوڑ دیا تو وہ پھر کھسیانی بلی کی طرح کھمبے نوچتے رہے۔شریعتی کو بھی قدامت پسند' پروفیشنل علما کی خاطر خواہ تائید حاصل نہ ہوسکی۔شریعتی کی تحریریں اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتی ہیں کہ اقبال' جمال الدین افغانی اور محمد عبدہٗ کی طرح عظیم مفکر تھے جنہوں نے مشرقی دنیا میں عظیم انقلاب پیدا کیا۔شریعتی کے ہاں بھی تاریخی پس منظر میں ہیومانزم کی بنیادی اہمیت ہے۔**زندہ رود** میں جاوید اقبال نے بتایا کہ اقبال مسلک انسانیت کو صرف سیاسی جہت سے متصف کرنے کے خلاف تھے۔شریعتی پر اقبال

کے اثرات کے نتیجے میں اسلام کا ایک آفاقی قوت کی حیثیت سے تصور گہرا ہوا۔ اجتہاد پر بھی انہوں نے زور دیا۔ آج کی تیز رفتار دنیا میں اجتہاد کا عدم استعمال جمود سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ ایک جہانِ نو کی تشکیل کے لئے انسان صاحبِ اختیار ہے۔ شریعتی کہتے ہیں کہ اقبال کی جہاں بینی، علم و فن کے بے شمار سرچشموں سے کشید کرنے کے نتیجے میں ذوقِ آرزو کے بطن میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

جاوید اقبال کہتے ہیں کہ علامہ اقبال کے لبرل ازم پر کئی اثرات میں سرسید کی قدامت پسندی، شبلی کے ریڈیکل ازم، جمال الدین افغانی کے پان اسلام ازم (Pan Islamism) کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ انہوں نے حکیم الامت کی تحریروں کے انداز پر بھی روشنی ڈالی۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال اپنے پیش رؤں کی طرح مناظرانہ انداز کی تحریروں سے گریز کرتے رہے ہیں۔ ان کا طرز عذر خواہانہ بھی نہیں ہے۔ انہوں نے بہت جرأت کے ساتھ خودی کی تعمیر پر زور دیا جو مسلمانوں کی سماجی زندگی اور سیاسی حیاتِ نو رکھنے کا باعث ہوئی۔ (مئے لالہ فام ص 37، 38) جاوید اقبال نے علامہ کی عظمت کا احساس دلانے کے لئے قائداعظم محمد علی جناح کی ایک تقریر کا حوالہ دیا جس میں انہوں نے اپنے لئے مسلم ریاست کی حکمرانی پر کلامِ اقبال کے انتخاب کو ترجیح دی (صدارتی تقریر ۲۴ر مارچ ۱۹۴۰ء)۔

ایک تخلیق کار کی تحریروں کو مختلف سطحوں پر دیکھا جا سکتا ہے اس طرح ان کے

خطبات' بیانات' مکتوبات اور جدوجہد کی سمتوں کو دیکھنے کے کئی زاویئے ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اقبال کے تصورِ انسان سے متعلق مختلف اور متضاد آرا بھی ممکن ہیں۔ یہہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ مذہبی' ثقافتی اقدار کی بہتر برقراری کے لئے ایک علاقہ کی تشکیل جس کی نوعیت چاہے کچھ ہو ایک ساز گار فضا مہیا کرتی ہے۔

فکرِ اقبال سمندر کی طرح ہے۔ اس کی گہرائی میں علم' تجربوں اور دردمندی کے بے شمار خزانے ہیں۔ جب بھی ہم اس میں غواصی کرتے ہیں نئے موتی' نئے صدف ہاتھ آتے ہیں۔ یہہ وہ سمندر ہے جس میں صدیوں کے مدو جزر ہیں۔ موجیں ہیں۔ سیلِ رواں ہے' لہروں کا ارتفاع ہے' ساحلوں کی سمتوں کی نشاندہی ہے۔ سمندر کے ساحل پر لہروں کی تحریروں کے ان مٹ نقوش ہیں۔ کبھی کبھی تعجب ہوتا ہے کہ ایک شخص نے جو اپنی ذات میں انجمن تھا' زندگی اور کائنات کے کتنے رازوں کا ہمیں شریک بنایا ہے۔ فلسفہ کی سطح پر قدروں کی گفتگو ہے' کلام کی وساطت سے جذبوں کی دنیا ہے' مکاتیب اور شذرات کے حوالوں سے جزئیات کے دفتر ہیں۔ اردو' انگریزی' فارسی کے دامن میں جو شعری کائنات روشن ہے وہ نسل در نسل راستوں کا عرفان عطا کرتی ہے۔ اس کی روشنی میں ہر نسل کو اپنے خوابوں کی منزل تلاش کرنے میں دشواری کا احساس نہیں رہتا۔ یہہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر نسل کو اپنی منزل خود تلاش کرنی چاہیئے۔

اس تیز رفتار عہد میں تصورات دھوپ چھاؤں کی طرح ہیں۔ بیسویں صدی کی

آخری سانسوں کی ڈور پر کئی نظریوں نے دم توڑ دیا۔ ہر نسل کو اپنے حالات اور شعور کی روشنی میں خوابوں اور آرزوؤں کا ہیولا تیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے Role Models کا بھی تعین کرتی ہے۔ وقت کی دھند میں وہ چہرے کھو جاتے ہیں جن میں رعنائیوں کی تابنا کی برقرار نہیں رہ پاتی۔ دانش وفکر سے نکلی ہوئی کچھ ایسی آوازیں بھی ہوتی ہیں جن کی موجیں دور تک پھیلنے کی طاقت رکھتی ہیں اور ان کی گونج صدیوں تک سنائی دیتی ہے۔ وقت اس بات کا شاہد ہے کہ بیسویں صدی میں ابھرنے والی اقبال کی توانا شعری آواز اکیسویں صدی میں بھی معنویت رکھتی ہے۔

اِظہارِ تشکُر

حسب ذیل اداروں کا تہہ دِل سے شکریہ ادا کرتا ہوں:

اقبال اکیڈمی، محفلِ اقبال شناسی، اقبال سوسائٹی (الینائی)، برطانیہ کے ثقافتی ادارے اور بزم اردو کیپ ٹاؤن (جنوبی آفریقہ)۔

میں شخصی طور پر ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں: غلام یزدانی، ظہیرالدین، منظور احمد منظور، یعقوب میراں مجتہدی، امتیاز الدین اور طالب خوندمیری۔ ان کے علاوہ بیرون ممالک میں امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے دوستوں کی وسیع تر کہکشاں کا شکریہ ادا کرنا ناگزیر سمجھتا ہوں۔ ان میں حسن چشتی، ڈاکٹر اصغر حسین، حبیب حسن الدین اور امجد حسین شامل ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی، ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی (شکاگو)، محمد مظہر الدین صاحب، پرنسپل انوارالعلوم کالج اور اس تعلیمی ادارہ کے احباب کے لئے بھی اظہارِ تشکر ہے۔

پروفیسر ایزک سکویرا، پروفیسر سید سراج الدین، پروفیسر تقی علی مرزا اور دوسرے دانشوروں و تنقید نگاروں کا بھی ممنون ہوں۔

اس کتاب کے لیے ریاض خوشنویس ریاض پرنٹرس کا خاص طور سے شکریہ ادا

کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں محمد یوسف الدین خان کا بھی تعاون رہا۔ انہوں نے کمپیوٹر کمپوزنگ بہت محنت کے ساتھ کی۔ وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔

آخر میں، میرا خوش گوار فریضہ باقی رہ جاتا ہے کہ میں اپنے ارکان خاندان کے لیے تہہ دل سے ممنونیت کا اظہار کروں۔ خاص طور سے اپنی والدۂ محترمہ، بھائیوں میں مجاہد احمد، اقبال احمد، اور ساجد احمد کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جو میری کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں خلوصِ دل سے شریکِ کار رہیں۔

نظروں کی کہکشاں

آج کے انسان کا فکری بحران یوسف اعظمی کے فکر وفن سے نمایاں ہے۔

گوپی چند نارنگ

یوسف اعظمی کا دِل مشرقی اور آنکھ مغربی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

یوسف اعظمی کی شاعری میں ادبی اور مذہبی محرکات کا ایسا جدید اظہار موجود ہے جو اپنے لہجے کی وضاحت اور احساس کی گہرائی کی وجہ سے مخاطب کے شعور کو بیدار کرتا ہے اور اس کی ماورائی جہت کا تعین بھی۔

حسن عسکری

جس طرح روح وجسم کے اتصال سے انسان وجود میں آتا ہے اسی طرح سخن و ادب کے امتزاج سے یوسف اعظمی صورت پذیر ہوئے ہیں۔ جب انسانیت کے سدھار کا پہلو موجود ہو تو وہ آفاقی صورتحال میں ڈھل جاتی ہے۔ یہی انفرادیت ڈاکٹر اعظمی کی سوچ وفکر میں مضمر ہے۔

اُردو ٹائمز نیویارک

بہ باطن شاعر ۔۔۔ ادب وشعر کا مطالعہ عبادت کی طرح کرتے ہیں۔

شاذ تمکنت ''روشنی کے مینار''۔

نرم لہجے اور پُر اثر انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ علم کا دریا موجزن دیکھنے کی خواہش ہو تو ڈاکٹر یوسف اعظمی سے بات کیجئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈگریاں انگریزی کی اور عشق اُردو سے ہے۔

پاکستان جرنل' لاس اینجلس۔

امریکہ کی محنت کش زندگی کے مطالعہ نے یوسف اعظمی کو اک نئی جہت سے روشناس کیا ہے۔ امریکہ میں یوسف اعظمی نے اپنے وسیع علم و عمل کی بنیاد پر بے شمار تجربات کیے ہیں۔

عثمانین یو۔ ایس۔ اے

یقین اور بے یقینی کے تضادات میں یوسف اعظمی میں اپنی معصومانہ سرشت اور اسی وصف سے پیدا ہونے والی چھٹی حس نے' جس مذہبی اور روحانی حیثیت کو قبول کیا ہے' اس کا اظہار اس کی نظموں میں' صوفیوں اور سنتوں کی طرح' بہت ہی میٹھے مترنم اور ایسے بے نیازانہ انداز میں ہوتا ہے کہ شدید واقعاتی ردِ عمل میں بھی تلخی' نفرت اور حقارت کا ذرّہ برابر عنصر شامل نہیں۔۔۔

''یوسف اعظمی اور تیسری آنکھ'' قومی زبان' اردو اکیڈمی' آندھرا پردیش۔

No writer of Urdu has generated so much commentary and criticism as Iqbal. The bibliography of Iqbal is easily the largest as far as Urdu writers are concerned. It would appear, therefore, that nothing more can be written on him. It must be said, to the credit of Dr. Yusuf Azmi, that he has managed to put together a number of essays on aspects of Iqbal's poetry and thought which have not been explored so far. In doing so, Dr. Yusuf Azmi has drawn on his doctoral dissertation which is a comparative study of Iqbal and T.S.Eliot, besides the experience which he gained in British and American universities as a visiting scholar. I particularly recommend to the students of Iqbal's poetry and thought the two essays entitled " Iqbal's Religious Thought in the Light of his Lectures," and " The Relevance of Iqbal in the 21st Century," both of which, I believe, covernew grounds. I do hope that Dr.Yusuf Azmi will continue his good work in future.

Prof. Taqi Ali Mirza

(Former Chairman, Dept. of English, Qsmania Univ.)

مصنف کی کتابیں

مطبوعہ:

- آسماں کا پیرہن 1986
- شہرِ صبا 2003
- اقبال جہانِ نو کی تلاش میں 2005

زیرِ طبع:

- آسماں کا پیرہن (دوسرا ایڈیشن)
- لہولہان کرچیاں (ناول)
- تاروں بھرا آنگن (غزلوں کا انتخاب)
- خوشبو کی شناخت (ادبی مضامین)

انگریزی میں:

- *Religion and Man in the Poetry of Eliot and Iqbal*
- *Roots and Fragrance* (انگریزی نظموں کا مجموعہ)

IQBAL - JAHAN-E-NAO KI TALASH MEIN

By : *Dr. Yusuf Azmi*

ڈاکٹر یوسف اعظمی وائس پرنسپل کی حیثیت سے شاداں کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی (ملحقہ جواہر لعل نہرو ٹکنالوجیکل یونیورسٹی) میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس سے قبل وہ سابق صدر شعبۂ انگریزی، چیرمین بورڈ آف اسٹڈیز انوارالعلوم کالج (Autonomous) اور کوآرڈینیٹر لینگویج سیل عثمانیہ یونیورسٹی کی حیثیت سے فائز رہے ہیں۔ ہندوستان میں تعلیمی شعبہ سے وابستہ رہنے کے علاوہ Adjunct Professor کی حیثیت سے ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی (امریکہ) میں انہوں نے خدمات انجام دیں۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے مختلف پوسٹ گریجویٹ کالجس میں، بارہ سال سے زائد عرصہ انگریزی میں زبان وادب کے تدریسی و تحقیقی فرائض انجام دیئے۔ ہندوستان اور امریکہ میں کئی تعلیمی، تہذیبی اور ادبی اداروں کے قیام میں ان کا اساسی رول رہا ہے۔

انہیں برطانیہ میں اعلیٰ تحقیقاتی کام کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ ہندوستان، یوروپ، امریکہ اور جنوبی آفریقہ کی جامعات میں کئی توسیعی لکچرس دینے کا اعزاز حاصل ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں کئی بین الاقوامی سمینارس، سمپوزیم اور کانفرنس میں شرکت کی۔ تعلیم و تحقیق کے علاوہ صحافت سے بھی ان کی وابستگی رہی ہے۔ انہوں نے امریکہ میں انڈین رپورٹر اینڈ ورلڈ نیوز کے ایڈیٹر کے علاوہ الہند۔ العرب کے مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اقبال اکیڈیمی کی مجلس مشاورت میں ایک عرصہ تک شامل رہے۔

حیدرآباد اور دنیا کے مختلف شہروں میں اقبال شناسی، کے سلسلے میں اُن کے توسیعی لکچرس نے اقبال فہمی کو اک نئی جہت عطا کی ہے۔ ادب کے علاوہ سماجیات، عمرانیات اور مذہب پر ان کے عمیق مطالعہ نے اس فکر و نظر کو جلا بخشی ہے جس کی عکاسی ان کی شعری تخلیقات میں بھی ملتی ہے۔ انہوں نے انگریزی کے شہرۂ آفاق شاعر ایلیٹ اور اقبال کے تقابلی مطالعہ پر تحقیقی کام کیا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، جنوبی افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کے سفر سے ان کی قوتِ مشاہدہ اور تجربات کو گہرائی اور وسعت حاصل ہوئی۔ انہوں نے اس وسیع النظری کے سہارے مغرب اور مشرق دونوں کی اعلیٰ اقدار کی پاسبانی اور ترجمانی کی۔ اس لیے اردو شاعروں میں انہیں اس حیثیت سے انفرادیت و امتیازی مقام حاصل ہے کہ انہوں نے مسرت سے بصیرت تک سفر کیا ہے اور یہ سفر جاری ہے۔

یوسف اعظمی کی شعری اور نثری تخلیقات، برصغیر کے اہم ادبی رسائل اور اخبارات کے علاوہ برطانیہ اور امریکہ میں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ بی بی سی لندن، وائس آف امریکہ ورلڈ سرویس اور ہندوستان میں دوردرشن آل انڈیا ریڈیو کے علاوہ دنیا کے مختلف نشری اداروں نے ان کے کلام کو پیش کیا اور انٹرویوز نشر کیے۔ مختلف زبانوں میں ان کی شاعری کے تراجم بھی ہوئے۔ انہوں نے تخلیقی اور تحقیقی کام پر کئی ایوارڈس بھی حاصل کیے۔

کمپوزنگ و طباعت: ریاض پرنٹرس، حیدرآباد فون 9391020926, 55712042